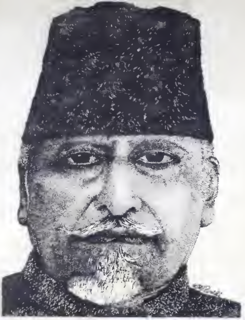


ابوالکلام آزاد

عبدالقوی دسنوی

ابوالکلام آزاد

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیوتشی بھگوان بدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں۔ اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلمبند کر رہا ہے۔
یہ شاید ہندستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

(ناگ ارجن کونڈ دوسری صدی عیسوی)
(بشکریہ نیشنل میوزیم۔ نئی دلی)

ابوالکلام آزاد

عبدالقوی دسنوی

ساہتیہ اکادمی

SPECIAL IMPORTS DISTRIBUTED BY
Vanguard Books Ltd, 45 The Mall, Lahore

01. Kamal Aur Zawal by Thucydides (Urdu) Rs 400
02. Baba Farid by B S Anand (Urdu) Rs 40
03. Abul Kalam Azad by A Q Dasnavi (Urdu) Rs 75
04. Inshaullah Insha by M Habib Khan (Urdu) Rs 30
05. Kalmuhi by R. Tagore (Urdu) Rs 125
06. Musafi by Noorul Hasan Qavi (Urdu) Rs 40
07. Sanjoj by R. Tagore (Urdu) Rs 175
08. Tazkara by Abul Kalam Azad (Urdu) Rs 250
09. Khutbaat e Azad by Abul Kalam Azad (Urdu) Rs 250
10. Sher o Hikmat by S. and M Tabassum (Urdu) Rs 395
11. Gora by R. Tagore (Urdu) Rs 200
12. Khwaja Haider Ali Atish by M Zakir (Urdu) Rs 40
13. Nasikh by Shabiul Hasan (Urdu) Rs 100
14. Julius Caesar by Shakespeare (Urdu) Rs 100
15. King Lear by Shakespeare (Urdu) Rs 100
16. Hamlet by Shakespeare (Urdu) Rs 100
17. Othello by Shakespeare (Urdu) Rs 100
18. Riyasat by Plato (Urdu) Rs200
19. Ek sau ek nazmaen by R. Tagore (Urdu) Rs 150
20. Rajinder Singh Bedi by Warris Alvi (Urdu) Rs 40
21. Ghubaar e Khatib by Abul Kalam Azad (Urdu) Rs 200
22. Medea by Euripedes (Urdu) Rs 40
23. Qasaid Suba Muallaquat by A H Noorani (Urdu) Rs100
24. Candide by Voltaire (Urdu) Rs 60
25. Do Saer Dhan by Thakazhi Siyasankra Pillai (Urdu) Rs 50
26. Ganji ki Kahani by Lady Murasaki (Urdu) Rs 60
27. Aurat by S Gupte (Urdu) Rs 60
28. Mir Anis by A J Zaidi (English) Rs 40
29. Kabir by P Machwe (English) Rs 40
30. Sh Nooruddin Wali by G N Gauhar (English) Rs 40
31. Shah Latif by K B Advani (English) Rs 40
32. Ghalib by M Mujeeb (English) Rs 40
33. Haba Khatoon by S N Sadhu (English) Rs 40
34. Bahi Vir Singh by S Singh (English) Rs 40
35. Warris Shah by G Charan Singh (English) Rs 40
36. Kalhana's Rajatarangnini (English) Rs 400
37. Nazir Akbarabadi by M Hassan (English) Rs 40
38. Hali by M Ram (English) Rs 40

ترتیب

پس منظر

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا سرا انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد سے جڑا ہوا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اگر یہ بھی کہا جائے کہ جنگِ آزادی کی کہانی کے ساتھ اس جنگ کے نہایت دلیر سپاہی، آزادی وطن کے متوالے مولانا ابوالکلام آزاد کی داستانِ حیات بھی شروع ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ چلتی ہے تو یہ بات بھی کچھ کم باوزن معلوم نہیں ہوتی ہے۔

کانگریس کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں پڑی اور اس کے صرف تین سال بعد مولانا آزاد مکّہ میں پیدا ہوئے۔ جہاں سے ۱۸۹۵ء میں وہ ہندوستان آئے اور ۱۹۰۳ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے والد کے جانشین بننے کے بجائے جنگ آزادی کے سپاہی بن کر میدانِ جنگ میں اترنے کی تیاری کرنے لگتے ہیں، تقسیم بنگال سے متاثر ہوتے ہیں، انقلابیوں کے سربراہ شیام سندر چکرورتی سے تعلق پیدا کرتے ہیں۔ ممالک اسلامیہ کا سفر کرتے ہیں اور وہاں کے

انقلابیوں سے راہ و رسم پیدا کرتے ہیں، واپس آکر چند سال بعد ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء سے "الہلال" جاری کرتے ہیں اسی کے ساتھ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی راہ پر آہستہ آہستہ چل نکلتے ہیں اور پھر انگریزوں کے خلاف رفتہ رفتہ صف آرائی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ مولانا آزاد نے آزادی کی لڑائی میں اس وقت نہایت بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ حصّہ لینا شروع کیا جب ہمارے بہت سے رہنما اپنے متعلق فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ انھیں اس میدان میں کب اور کیسے اترنا ہے اور کس طرح حصّہ لینا ہے۔

مولانا آزاد کی پہلی نظر بندی ۱۹۱۶ء میں ہوئی اور پھر بار بار ۱۹۴۵ء تک چھ مختلف وقتوں میں تقریباً دس سال آہنی سلاخوں کے پیچھے زندگی گزاری اور جیل کے باہر باقی زندگی کا کوئی حصّہ نہ تھا جو وطن کی خدمت میں صرف نہ ہوا ہو یا جنگِ آزادی کے لیے وقف نہ ہوا ہو۔ خلافت تحریک، نمک ستیہ گرہ، عدم تعاون عدم تشدّد، ترکِ موالات، بائیکاٹ، سودیشی تحریک، کرپس مشن ہندوستان چھوڑ دو، شملہ کانفرنس، کیبنیٹ مشن۔ عارضی حکومت، ماؤنٹ بٹن مشن صبحِ آزادی، ہر تحریک، ہر اقدام اور ہر فیصلے، جنگ آزادی کے ہر موڑ پر، وطنِ عزیز کے لیے ایثار و قربانی کی ہر ضرورت کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد نہایت جوش و ولولہ کے ساتھ، ہمت اور حوصلہ کے ساتھ نظر آتے ہیں اس لیے یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حیات ابوالکلام آزاد کے مطالعہ میں ہندوستان کی جنگِ آزادی کی کہانی پوشیدہ محسوس کی جائے گی۔

حیات

"میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں اور
تینوں خاندان ہندوستان وحجاز کے ممتاز بیوت علم وفضل
اور اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں، دنیوی عزّت وجاہ
کی اگرچہ ان میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دنیا نے اپنی
عزّتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ ان کے سامنے پیش کیا اور کبھی انھوں
نے قبول کیا کبھی رَد کردیا[۱]۔"

بزرگوں کے قافلہ کا ایک حصّہ ہرات سے روانہ ہوا اور ۱۵۱۶ء سے ۱۵۳۰ء کے درمیان شہنشاہ بابر کے دورِ حکومت میں ہندوستان کی حدود میں داخل ہوا اور آگرہ کا رُخ کیا اور اسی شہر کو بود و باش کے لیے انتخاب کیا۔ پھر شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں یہ قافلہ آگرہ سے کوچ کرکے منتخب روزگار شہر دہلی پہنچا اور وہیں قیام پذیر ہوا۔

مولانا جمال الدین معروف بہ شیخ بہلول دہلوی کا نام خاص طور سے

---

[۱] تذکرہ از ابوالکلام آزاد: مرتبہ مالک رام: ساہتیہ اکادمی نئی دہلی دوسری بار ۱۹۸۱ء ص ۲۵۔

عقیدت اور احترام کے ساتھ اس وجہ سے بھی لیا جاتا ہے کہ انھوں نے اکبر کی مذہبی کجرویوں کی سخت مخالفت کی تھی انھیں بزرگ محترم کے بیٹے شیخ محمد، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے مرید تھے شیخ احمد شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں مدتوں معتوب رہے۔ ایسا کرنا نہایت ہمت اور حوصلے کی بات تھی لیکن چونکہ وہ دین کے معاملے میں نہایت نڈر اور بے باک تھے اس لیے کسی کی ناراضگی کی انھوں نے پرواہ نہیں کی۔

شیخ جمال الدین کے خاندان سے مولانا ابوالکلام آزاد کے پردادا شاہ محمد افضل کا ننہالی رشتہ تھا۔ مولانا آزاد کے دادا شیخ محمد ہادی انہی کے فرزند تھے ان کی شادی مولانا منوّرالدین کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ مولانا منوّرالدین کا تعلق قصور سے تھا۔ انھیں حضرت شاہ عبدالعزیز سے عقیدت ہو گئی تھی۔ ان کی شہرت سن کر وہ قصور سے دہلی پیدل آئے تھے۔ ان کا یہ سفر ١٨٠٠ء یا ١٨٠١ء میں ہوا تھا۔ اس وقت مولانا منوّرالدین کی عمر سولہ یا سترہ سال سے زیادہ کی نہ تھی۔ دہلی پہنچ کر وہ شاہ عبدالعزیز سے درس لینے لگے۔ لیکن ان کے والد رشید الدین جو، ہرات سے شاہ ابدالی کے ساتھ پنجاب آئے تھے اور قصور کو اپنا مستقر بنایا تھا، جب انتقال کر گئے تو مولانا منوّرالدین دہلی سے قصور گئے اور خاندان کے تمام افراد کو اپنے ساتھ لے کر دہلی واپس آئے اور ان کے ساتھ زندگی گزارنے لگے۔

مولانا خیرالدین شیخ محمد ہادی کے بیٹے تھے گویا مولانا منوّرالدین، مولانا خیرالدین کے نانا ہوئے بلاشبہ مولانا آزاد کا یہ فرمانا بجا ہے کہ ان کے بزرگ علم و فضل کے گہوارہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا خیرالدین کی پیدائش ١٨٣١ء میں ہوئی تھی، ان کی عمر ابھی چار

سال ہی کی تھی کہ ان کے والد شیخ محمد ہادی کا انتقال (غالباً ۱۸۳۴ء یا ۱۸۳۵ء) ہوگیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے نانا نے ان کی ہر طرح کی دیکھ ریکھ اور پرورش کی۔ انھوں نے تعلیم اور تربیت کی منزلیں بھی اپنے نانا کی ہی نگرانی اور سرپرستی میں طے کیں۔

اس وقت ملک کی حالت اچھی نہ تھی خاص طور سے شاہی خاندان کے سیاسی و اخلاقی حالت سے مولانا منورّالدین بہت دل برداشتہ اور فکرمند تھے۔ انھوں نے یہاں سے ہجرت کر کے حجاز میں قیام کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۵۵ء میں وہ دہلی سے بمبئی مولانا خیرالدین کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے، راستہ میں بھوپال میں کچھ دن قیام کی غرض سے رک گئے۔ یہاں کی حکمراں ان دنوں نواب سکندر بیگم تھیں۔ وہ مولانا منورّالدین کے وعظ اور پند و نصیحت سے بے حد متاثر ہوئیں۔ ادھر ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کا ہنگامہ شروع ہوگیا اس لیے بھوپال ہی میں کچھ دن اور ٹھہرنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ جب امن و امان قائم ہوا تو وہ بمبئی کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں سے حجاز کا سفر کریں، لیکن بمبئی پہنچ کر علیل ہوگئے جس کی وجہ سے وہیں قیام کرنے پر مجبور ہوئے لیکن رفتہ رفتہ ان کے مریدوں نے انھیں گھیر لیا اس طرح ڈیڑھ دو سال اور گزر گئے۔ اس دوران میں مولانا نورالدین علیل ہوگئے اور وہیں ۱۸۵۸ء یا ۱۸۵۹ء میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد مولانا خیرالدین تنہا حجاز کے لیے روانہ ہوئے جہاں پہنچ کر مکّہ معظمہ کو اپنے مستقل قیام کے لیے انتخاب کیا اور وہیں بود و باش اختیار کر لی۔ مکّہ ہی میں ان کی ملاقات دو مشہور عالموں شیخ عبداللہ سراج اور شیخ محمد ظاہر وتری سے ہوئی۔ مولانا خیرالدین ان دونوں حضرات کی خدمت

میں باقاعدہ حاضری دیتے اور ان کے علم وفضل سے فیض اٹھاتے۔ یہیں انھوں نے اپنے رہنے کے لیے ایک مکان کی تعمیر کرائی۔ حجاز پہنچنے کے تقریباً دس سال بعد یعنی ۱۸۷۰ء یا ۱۸۷۱ء میں ان کی شادی شیخ محمد ظاہر وتری کی بھانجی عالیہ[۵] سے ہوئی۔

شادی سے تقریباً سترہ[۶] سال بعد مولانا ابوالکلام آزاد ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ یعنی اگست یا ستمبر ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ان سے بڑی تین بہنیں زینب بیگم، فاطمہ بیگم آرزو، حنیفہ بیگم آبرو اور ایک بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ تھے۔ مولانا خیرالدین نے اپنے چھوٹے بیٹے ابوالکلام آزاد کا تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا۔

بچپنے سے ہوش سنبھالنے تک کی منزل مولانا ابوالکلام نے مکہ کی مقدس سرزمین میں گزاری مادری زبان عربی تھی، اسی عربی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں، اسی عربی زبان نے پہلے پہل کان میں رس گھولا۔ اسی عربی زبان میں بولنا سیکھا اور اسی عربی زبان میں اپنی ضروریات کا اظہار کیا گویا بچپنے سے عربی زبان ان کے دل و دماغ میں رچ بس گئی تھی اور ان کے احساس وجذبات، افکار وخیالات کو سمجھنے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔

ابھی ان کے ذہن و دماغ میں احساس وجذبات بیدار ہی ہو رہے تھے اور ہوشمندی نے آنکھ کھولنے کی کوشش اور شعور نے بیدار ہونے کی تیاریاں کی ہوں گی کہ ان کی زندگی نے پانچویں سالگرہ میں قدم رکھا اور انھیں اپنے

---

[۵] "انڈیا ونس فریڈم" صفحہ ایک پر مولانا آزاد نے "عالیہ" کو شیخ محمد ظاہر وتری کی دختر تحریر کیا ہے۔ لیکن تذکرہ میں بھانجی بتایا ہے۔ عبدالقوی دسنوی۔

بڑے بھائی غلام یٰسین آہ کی بسم اللہ کی تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ شیخ عبداللہ میرداد نے بڑے بھائی کی رسم بسم اللہ کے ساتھ ساتھ چھوٹے بھائی کی بھی رسم بسم اللہ کرادی اور اس طرح مولانا آزاد کی تعلیم' ان کی زندگی کی پانچویں بہار سے شروع ہوگئی۔ پڑھانے کی ذمہ داری ان کی خالہ نے لے لی تھی۔ چنانچہ دونوں بھائیوں کی تعلیم ساتھ ساتھ ہونے لگی۔ جناب مالک رام لکھتے ہیں کہ مکّہ میں شیخ محمد عمر اور شیخ حسن اس وقت مشہور اساتذہ تھے انھوں نے بھی ان دونوں بھائیوں کو تعلیم دی' قرآن مکّہ ہی میں ختم کیا' اس وقت مولانا آزاد کی عمر نو سال سے زیادہ نہ تھی [۳ے]

غالباً ۱۸۹۵ء میں مولانا آزاد کے والد کے پاؤں کی ہڈی کے ایک حادثے میں ٹوٹ جانے کی وجہ سے علاج کی غرض سے کلکتہ آنا پڑا' جہاں کے علاج سے ٹوٹی ہوئی ہڈی درست تو ہوگئی لیکن پاؤں چھوٹا ہوگیا۔ یہیں کلکتہ میں ایک سال کے بعد ۱۸۹۶ء میں مولانا آزاد کی والدہ عالیہ بیگم کا انتقال ہوگیا اور کلکتہ ہی میں مانکتلا کے قبرستان میں دفن کی گئیں۔ اس حادثہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا خیرالدین نے کلکتہ ہی کو اپنا مسکن بنا لیا اور وہیں کے ہو رہے۔

مولانا خیرالدین کو بچوں کی تعلیم کی فکر بہت زیادہ تھی اس لیے انھوں نے مکّہ ہی میں ان کی تعلیم شروع کردی تھی' لیکن وہ مدارس کی تعلیم کسی سبب پسند نہیں کرتے تھے اس لیے کلکتہ میں بھی گھر ہی پر پہلے خود ہی اپنے بیٹوں کو تعلیم دینی شروع کی' ابتدا اُردو فارسی سے کی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ معیار بڑھاتے گئے۔

[۳ے] مولانا ابوالکلام آزاد: مالک رام:۔ تحریر دہلی جلد ۲ نمبر ۱ ص ۸۲

بعد میں دوسرے معتبر اساتذہ کا بھی انتظام کیا جو گھر ہی پر آ کر پڑھاتے تھے ۔ "خلاصہ ہندی" اور "مصور فیوض" پڑھنے کے بعد، گلستاں بوستاں کی باری آئی ۔ آمد نامہ کے مصادر حفظ کرائے گئے ۔ عربی میں "میزان منشعب" اور "اجرومیہ" وغیرہ پڑھائی گئیں پھر ضرورت کے لحاظ سے دوسری بہت سی مفید کتابوں سے گزرنا پڑا ۔

مولانا خیرالدین کے علاوہ آزاد کے دوسرے اساتذہ میں خاص طور سے مولوی محمد یعقوب، مولوی نذیر الحسن امیٹھوی، مولوی محمد ابراہیم، مولوی محمد عمر، شمس العلماء مولانا سعادت حسین قابل ذکر ہیں جنھوں نے ابوالکلام آزاد کی تعلیم اور ذہنی تربیت ایسی کی کہ وہ ایک جوہر قابل بن کر سامنے آئے اور ایک دنیا کو اپنے افکار و خیالات سے آگاہ کیا اور فیض بھی پہنچایا ۔

۱۹۰۰ء میں جبکہ مولانا آزاد کی عمر مشکل سے بارہ تیرہ سال کی ہوگی وہ عربی مبادیات سے گزر چکے تھے اور شرح ملّا اور قطبی کے دور میں تھے اور فارسی کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے[۵۸]

۱۹۰۳ء میں جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد عمر کی پندرھویں بہار کا خیر مقدم کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے درس نظامیہ سے فراغت پالی تھی، اس کے بعد اس خیال سے کہ پڑھا ہوا جب تک پڑھایا نہ جائے صلاحیت پختہ نہیں ہوتی مولانا آزاد کو "فاتحہ فراغ[۵۹]" کی مجلس میں ہی طلبہ کی ایک

---

۵۸ غبار خاطر: ابوالکلام آزاد، مرتبہ مالک رام ص ۹۸

۵۹ " " " " ص ۹۹

جماعت حوالے کی گئی۔ جس کے قیام کے اخراجات مولانا خیرالدین نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد پڑھانے کے فرائض کو حسن و خوبی انجام دینے لگے۔

مولانا آزاد کو ذہانت اور ذکاوت کی دولت وراثت میں ملی تھی[۱] اچھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے اس لیے بہت جلد اُردو فارسی اور عربی میں بڑی اچھی صلاحیت پیدا کرلی۔ ۱۸۹۹ء / ۱۹۰۰ء میں ہی دوران تعلیم میں انھوں نے ترجمہ کا کام بھی شروع کردیا تھا اور بعض اہم تحریروں کے ترجمے بھی کیے تھے۔ جلال الدین سیوطی کے ایک اہم رسالہ "نور اللمعہ فی فضائل الجمعہ" کا اُردو ترجمہ اس تحریک پر کیا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے استاد مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کو اس رسالہ کے ترجمہ کی ضرورت تھی وہ یہ رسالہ مولانا آزاد کے ماموں زاد بھائی محمد سعید سے ترجمہ کرانا چاہتے تھے وہ ان دنوں مکّہ سے آئے ہوئے تھے، ترجمہ کا کام انھوں نے شروع کیا تو اردو نہ جاننے کی وجہ سے انھیں مشکلات پیش آنے لگیں ایک دن مولانا آزاد نے ان سے رسالہ لے کر ترجمہ لکھوا دیا جس سے مولوی حبیب الرحمٰن بہت خوش ہوئے اور متاثر بھی ہوئے[۲]۔ انھیں دنوں مولانا جامی کی تصنیف "نفحات الانس"، کے کچھ حصّے کا بھی مولانا آزاد نے ترجمہ کیا تھا۔ فارسی تحریر کی مشق کے لیے مولانا محمد حسین کی مشہور کتاب "آب حیات" کا ترجمہ بھی شروع کردیا تھا[۳]۔

نثر میں مولانا کی ابتدائی تحریریں دراصل وہ ہیں جن میں انھوں نے

---

[۲] آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی: مولانا ابوالکلام آزاد بہ روایت ملیح آبادی ص ۲۶۹–۲۷۰

[۳] ارمغان آزاد جلد اوّل مرتبہ ابو سلمان شاہجہاں پوری ص ۱۰۵۔

مختلف شرح و حواشی کا مطالعہ کرکے اپنے طور پر ان کے مطالب و مفہوم کو سمجھنے کے لیے اپنے خیالات قلمبند کیے تھے ان کی اس طرح کی کوششوں کو ان کے والد مولانا خیرالدین نے بہت پسند فرمایا تھا[۵۸] اس کے بعد مولانا آزاد نے جن کتابوں کو پڑھا ان کے معنی و مطالب اسی طرح پیش کرنے کی کوشش کی[۵۹] اس کے ساتھ بعض کتب و رسائل کے مطالعہ کے بعد ان سے اخذ کرکے چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے۔ "تعصب کی مضرتیں"، اور "عوائد و رسوم"، ایسے ہی ہیں۔

ابھی مولانا آزاد کی عمر تیرہ سال ہی کی ہوگی کہ مدراس کے ایک اخبار "جریدۂ روزگار" میں ان کی نظر "یادگار غالب" کے اشتہار پر پڑی۔ جس کے مطالعہ کا شوق ایسا پیدا ہوا کہ وہ اسے منگوانے پر مجبور ہوئے اور جب وہ کتاب ان کے پاس آگئی تو انھوں نے اس کا مطالعہ نہایت شوق سے کیا اردو نثر کی یہ شاید پہلی معیاری کتاب تھی جس نے مولانا کے لیے آئندہ مطالعہ کا دروازہ کھول دیا۔ پھر تو مولانا نے نثری کتابیں خوب پڑھیں۔

اس دوران میں انھوں نے دسمبر ۱۸۹۹ء میں امام غزالی[۶۰] کی سوانح حیات بھی لکھنی شروع کردی تھی۔ والد کی خواہش سے طب کی تعلیم بھی حاصل کرنے لگے تھے لیکن سات آٹھ ماہ سے زیادہ وقت نہ دے سکے اس لیے نہ تو امام غزالی کی حیات مکمل ہوئی نہ ہی طب کی تعلیم تکمیل کو پہنچی۔

---

۵۸ ارمغان آزاد جلد اوّل مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری ص ۱۰۳

۵۹ نقش آزاد: غلام رسول مہر ص ۳۲

۶۰ مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری ص ۶۹

۱۹۰۰ء تک پہنچتے پہنچتے وہ جلسوں میں شریک ہونے لگے تھے اور کلکتہ سے باہر بھی جانے لگے تھے۔ چنانچہ ۴ر نومبر ۱۹۰۰ء کو ندوہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ میں غالباً شرکت کی تھی۔ چند ماہ بعد ۱۹۰۱ء میں انھوں نے مولوی عبدالرحیم اسیر انڈمان کی تصنیف "تذکرہ صادقہ"، یعنی "الدر المنثور فی تراجم اہل صادقفور" کی تقریظ لکھی جس کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آزاد اپنی کم عمری کے باوجود اچھی صلاحیت کے ساتھ ساتھ نیک نامی اور شہرت بھی حاصل کر چکے تھے۔ ۱۹۰۱ء ہی سے مولانا آزاد نے عام جلسوں اور خاص محفلوں میں تقریر کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا اور اپنی خطابت سے لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر اور مسحور کرنے لگے تھے۔

یہ تو حیرت میں ڈالنے والی بات تھی ہی کہ ابھی مولانا تعلیم کی ابتدائی منزل میں تھے کہ غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور ابھی مضامین اور مقالے لکھنے کی طرف ٹھیک سے رجوع بھی نہیں ہوئے تھے کہ شعر گوئی نے دل میں چٹکیاں لینی شروع کر دی تھی۔ اس وقت عمر کے اعتبار سے وہ دس گیارہ سال سے زیادہ کے نہیں ہوئے تھے۔ اس شوق کی تفصیل مولانا آزاد اس طرح بیان کرتے ہیں :

"یہ عجیب بات ہے کہ درسیات کے باہر جس چیز سے میں سب سے پہلے آشنا ہوا وہ شاعری تھی۔ مجھے یہ ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ پہلے پہل کیوں کر میں اس چیز سے واقف ہوا۔ لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ زیادہ شوق اس کا مولوی عبدالواحد خاں سہسرامی ایک شخص کی وجہ سے ہوا جو مولوی محمد فاروق چریا کوٹی کے ایک مستعد شاگرد تھے۔ اردو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔

وہ ایک عزیب گھر کے آدمی تھے۔ ان کی بہن ہم لوگوں کے یہاں گھر کے اوپر کے کام کے لیے ملازم تھی۔ اس تعلق سے ان کی بھی آمد و رفت شروع ہوئی۔ اس وقت میری عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی دوپہر کے وقت یہ آیا کرتے اور بہن سے ملتے۔ اس میں ہم لوگوں سے بھی بات چیت ہونے لگی اور پھر ہمارے باہر کے درس کے اوقات میں بھی آنے لگے۔ اس زمانے میں کلکتے میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا۔ اس کا انتظام پٹنہ کے بادشاہ میاں نامی ایک رئیس نے کیا تھا اس کے لیے کلکتے سے باہر کے بھی مشہور اشخاص مثلاً جلال مرحوم بلائے گئے تھے۔ تین طرحیں دی گئی تھیں جن میں ایک یہ تھی:

مطلب کی بات صاف کہوں کیا مجال ہے

تین دن تک مسلسل مشاعرہ جاری رہا تھا۔ مولوی عبدالواحد نے غزلیں لکھیں تھیں اور مشاعرے میں پڑھی تھیں۔ انھوں نے اس کا حال ہم لوگوں کو سنایا اور اپنی غزلیں بھی سنائیں۔ یہ پہلی منظم دلچسپی ہے جو میرے حافظے میں شاعری کی نسبت پائی جاتی ہے۔ مجھ پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا اور اب ان سے ہم بارے میں صحبتیں رہنے لگیں[11]

---

[11] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: مولانا ابوالکلام آزاد: بہ روایت ملیح آبادی ص ۲۳۰

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ مولوی عبدالواحد صاحب اردو شاعری کا تذکرہ مختلف طرح سے کرتے، کبھی اشعار سناتے کبھی ان اشعار سے متعلق اگر کوئی واقعہ ہو، تو وہ بھی بتاتے۔ شاعروں کا مقابلہ کرتے اور ان کے معرکوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز سے پیش کرتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری سے مولانا آزاد کی دلچسپی بڑھنے لگی، چنانچہ انھوں نے شعرا کے دیوان خریدے اور ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ اس زمانے میں بمبئی سے ایک گلدستہ "ارمغان فرخ" نیا نیا نکلا تھا۔ اس میں ہر ماہ مصرعہ طرح دیا جاتا تھا ایک میں مصرعہ طرح تھا:

پوچھی زمیں کی تو کہی آسمان کی

اس مصرعہ پر عبدالواحد خاں نے کچھ شعر کہے۔ ایک دن ان میں سے چند شعر آزاد کو بھی سنائے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ آزاد کی شعر گوئی کی صلاحیت ابھر گئی اور انھوں نے تیئیس شعر کہہ ڈالے لیکن جب تک اطمینان نہ ہوا خود ہی اصلاح کرتے رہے۔ بعد میں سترہ شعر انتخاب کیے جب اطمینان ہوا تب عبدالواحد خاں کو مطلع سنایا:

"وہ سنتے ہی چیخ اٹھے اور اس قدر تعریف کی کہ میں جامے میں نہ سمایا اور طبیعت کو ایک عجیب قسم کی فرحت حاصل ہوئی ایک ایسا نشہ چڑھ گیا کہ معلوم ہوتا تھا گویا ایک غیر معمولی فتح مندی حاصل ہوئی ہے جب اور اشعار سنائے تو ہر شعر پر کھڑے ہو ہو کر انھوں نے تحسین کی۔"[۱۳]

---

[۱۳] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: مولانا ابوالکلام آزاد: بہ روایت ملیح آبادی ص ۲۳۹

اس تعریف و تحسین کے بعد ہی مولانا نے اپنا تخلص "آزاد" رکھا۔ آزاد تخلص رکھنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں گلدستوں میں غزلیں حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دی جاتی تھیں۔ مولانا کی خواہش ہوتی تھی کہ اس ترتیب میں ان کا نام ابتدا ہی میں ہو۔ لیکن "انڈیا ونس فریڈم" میں "آزاد" تخلص رکھنے کی وجہ مولانا نے یہ بتلائی ہے:

"دو تین سال تک میرے دل میں شدید بے چینی رہی اور میں اپنے شکوک کو دور کرنے کی آرزو میں تڑپتا رہا، کبھی کوئی کیفیت طاری ہوتی، کبھی کوئی اور بالآخر میں ایک منزل پر پہنچا، جب وہ تمام بندشیں ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوگئیں جو میرے خاندان اور خاندان کی فضا میں تربیت نے میرے ذہن پر لگائی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں تمام رسمی اور مصنوعی رشتوں اور پابندیوں سے آزاد ہوگیا ہوں اور میں نے فیصلہ کیا کہ آگے قدم بڑھاؤں گا تو اسی راہ پر جو میں نے اپنے لیے انتخاب کی ہو۔ یہی وہ زمانہ تھا جب میں نے "آزاد" کا عرف اختیار کیا۔[۳۱]"

بعد میں عبدالواحد خاں کے مشورے سے ہی یہ غزل بمبئی سے نکلنے والے گلدستہ "ارمغان فرخ" کو اشاعت کے لیے بھیج دی۔ تقریباً ایک ماہ میں جب وہ غزل شائع ہوئی تو مولانا آزاد کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

لیکن جو لوگ مولانا آزاد کی غزلیں پڑھتے یا سنتے تھے ان میں سے

---

[۳۱] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد مترجم محمد مجیب ص ۱۳

اکثر کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ غزلیں مولانا آزاد ہی کی ہیں۔ انھیں میں مرزا غالب کے شاگرد نادرشاہ خاں شوخی رامپوری تھے جو اس وقت کلکتہ ہی میں مقیم تھے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"انھیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ مجھے پکڑ کے ایک کتب فروش کی دکان پر لے گئے جس کی دکان مسجد سے متصل تھی کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے' میں بیمار ہوں' وہ غزل کے لیے متقاضی ہے چند شعر اسی وقت کہہ دو' میں سمجھ گیا' امتحان لینا چاہتے ہیں' انھوں نے زمین بتلائی یاد نہ ہو' شاد نہ ہو' میں نے وہیں بیٹھے ہوے چھ شعر کہہ دیئے' کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیئے میں نے ایک شعر اور کہہ دیا:

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشا ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی' ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے "صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی"۔[۱۴]

فارسی زبان سے انھیں دلچسپی اپنے والد مولانا خیرالدین کی وجہ سے ہوئی تھی لیکن جب شاعری شروع کی تو فارسی لغت و ادب کے مطالعہ کی طرف

---

[۱۴] نقش آزاد: غلام رسول مہر ص ۱۰۸

توجہ کی، ساتھ ساتھ ایرانیوں سے راہ ورسم پیدا کی تاکہ ان سے بات چیت کے مواقع ملیں اور ان کی فارسی میں بولنے اور لکھنے کی صلاحیت بہتر ہوجائے۔

لیکن مولانا ابوالکلام آزاد بہت دنوں تک شعر وشاعری کی زلف کے اسیر نہیں رہے۔ جنوری ۱۹۰۳ء کے بعد گلدستوں یا رسائل میں شائع شدہ کلام نہیں ملتا ہے۔ اس کی بھی اطلاع نہیں مل سکی ہے کہ وہ اس کے بعد مشاعروں میں شریک ہوسکے تھے یا نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعری کی مدّت چار پانچ سال سے زیادہ نہیں رہ سکی اور وہ بہت جلد مشاعروں کی "آہ واہ" کی مصنوعی دنیا سے بیزار ہوگئے۔ اگرچہ اس عمر میں ہی انھوں نے شاعر کی حیثیت سے خاص شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی تھی۔

گویا ۱۹۰۳ء میں داخل ہوتے ہوتے مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف اپنی تعلیم سے فارغ ہوچکے تھے بلکہ بحیثیت عالم، شاعر، مضمون نگار، مترجم اور مقرر کے، عمر کے لحاظ سے حیرت میں ڈالنے والی اچھی خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل کرچکے تھے ان کے مضامین اور کلام اس وقت تک — "ارمغان فرخ"، "احسن الاخبار"، "نیرنگ عالم"، "المصباح"، "خدنگ نظر" "مرقع عالم"، "مخزن"، "پنچ"، "ایڈورڈ گزٹ"، "تحفہ احمدیہ" وغیرہ میں شایع ہوکر مقبول ہوچکے تھے۔

شاعری شروع کی تو خیال ہوا کہ ایک رسالہ گلدستہ کی صورت میں نکالا جائے، خیال نے عملی جامہ پہنا اور مولانا آزاد ۱۸۹۹ء میں "نیرنگ عالم" نام کا ایک گلدستہ شایع کرنے میں کامیاب ہوئے گویا گلدستہ کی راہ

سے صحافت کی دنیا کی طرف مڑنے کی ان کی یہ پہلی کوشش سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن اس نے مختصر عمر پائی۔ اس سے انھیں تسکین بھی کہاں ہوسکتی تھی، اس لیے جلد ہی ۱۹۰۰ء میں ایک ہفتہ وار اخبار "المصباح" جاری کیا۔ یہ پہلا اخبار تھا جسے مولانا آزاد نے مرتب کیا تھا اس کی اشاعت چونکہ عید کے ماہ مبارک میں ہوئی تھی، اس لیے مولانا آزاد نے "عید" پر ایک ایڈٹنگ آرٹیکل تحریر کیا تھا جسے خوب پسند کیا گیا۔ اس اخبار نے بھی تین چار ماہ کی مختصر عمر پائی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد، صحافت کے ذریعہ اُردو زبان و ادب اور قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے بہتر موقع کی تلاش میں تھے چنانچہ "المصباح" کے بند ہو جانے کے بعد انھوں نے مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ "فن اخبار نویسی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو "مخزن"، لاہور مئی ۱۹۰۲ء میں شایع ہوا۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ سے منشی نوبت رائے نظر ایک ماہنامہ "خدنگ نظر" نکالتے تھے۔ مولانا آزاد کی شہرت اور صلاحیت دیکھتے ہوئے انھوں نے حصہ نثر کی ترتیب کا کام ان کے ذمہ کیا اور انھیں اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر کیا۔ مارچ ۱۹۰۳ء کے "عرض حال" میں لکھتے ہیں:

> "ہم نے اپنی کوشش میں اپنے دلی دوست ابوالکلام مولوی محی الدین صاحب آزاد دہلوی کو بھی شریک کرلیا ہے جن کے اکثر مضامین "خدنگ نظر" اور دوسرے معزز اُردو جرایدمیں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ آئندہ سے وہ "خدنگ نظر" کے حصہ مضامین کے لیے اسسٹنٹ اڈیٹر

کے فرائض ادا کریں گے جو انھوں نے بخوشی قبول فرمائے ہیں[۵]۔"

"ایڈورڈ گزٹ" شاہجہاں پور کے بھی کچھ عرصہ تک آزاد وقتی اڈیٹر رہے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا ایک ماہنامہ "لسان الصدق"، ۲۰/نومبر ۱۹۰۳ء کو کلکتہ سے جاری کیا، جس کی طباعت ترتیب، مضامین اور مقاصد نے پہلی ہی نظر میں شائقینِ ادب کو اس کا قدرداں بنا دیا۔ ہر طرف سے تبصروں اور خطوط کے ذریعہ اس ماہنامہ کی تعریف و توصیف ہونے لگی اور مولانا آزاد ایک اہم شخصیت کے مالک متصور کیے جانے لگے۔

اس ماہنامہ کے حسب ذیل مقاصد نے خاص طور سے چونکایا اور اپنی طرف متوجہ کیا:

(۱) سوشیل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنی۔

(۲) ترقی اُردو یعنی اُردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔

(۳) علمی مذاق کی اشاعت، بالخصوص بنگالہ میں۔

(۴) تنقید یعنی اردو تصنیف پر مصنفانہ ریویو کرنا۔

ان مقاصد کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی مولانا آزاد پندرہ سال کے ہی ہوئے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام کرنے کا عزم

---

[۵] مولانا ابوالکلام آزاد اور خدنگ نظر: عبدالقوی دسنوی: ہماری زبان یکم نومبر ۱۹۶۹

رکھتے تھے۔ ان میں علمی ذوق و شوق پیدا کرنا ان کی زبان اُردو کے ادبی سرمایہ کے دائرہ کو وسیع کرنا اور ان میں تنقیدی شعور بیدار کرنا چاہتے تھے۔

اگرچہ ان کا یہ سارا کام مسلمانوں تک محدود تھا لیکن یہیں سے ان کے مستقبل کے لامحدود کاموں کا ہلکا سا اشارہ ملتا ہے اور یہ بات صاف طور سے محسوس ہوتی ہے کہ وہ مستقبل میں ملک و قوم کی خدمت کے عزائم اسی زمانے سے رکھتے تھے بلکہ خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔

"لسان الصدق" نے بھی زیادہ عمر نہیں پائی۔ ۱۹۰۳ء میں نومبر، دسمبر کے دو شمارے ۱۹۰۴ء میں جنوری تا مئی پانچ الگ الگ شمارے اور جون جولائی کا مشترکہ شمارہ شائع ہوا پھر ۱۹۰۴ء کا کوئی شمارہ نہیں ملتا البتہ ۱۹۰۵ء میں اپریل مئی کا مشترکہ شمارہ (۱، ۲) نکل سکا۔ اس کے بعد غالباً یہ ماہنامہ بھی بند ہوگیا اس لیے کہ اب تک کہیں کوئی اور شمارہ دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔

اب ایک طرف مولانا آزاد صحافت کی دنیا میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے دوسری طرف انھوں نے قومی جلسوں میں بھی شریک ہونا شروع کردیا تھا اور ان میں عملی حصہ لینے لگے تھے۔ ساتھ ہی علامہ شبلی اور ندوہ سے بھی وہ قریب ہوتے جا رہے تھے دسمبر ۱۸۹۹ء میں آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کے تیرھویں اجلاس منعقدہ کلکتہ میں مولانا آزاد جب شریک ہوئے تھے تو علامہ شبلی نعمانی سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی[۵۸] اور انھوں نے مولانا شبلی کے کتب خانہ سے مستفیض

[۵۸] مکاتیب ابوالکلام: ابوسلمان شاہجہانپوری ص ۶۹

ہونے کی خواہش ظاہر کی تھی اور مولانا شبلی نے مولانا آزاد کو فہرستِ کتب بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ تقریباً ایک سال بعد ۴ر نومبر ۱۹۰۰ء (۱۱ر رجب ۱۳۱۸ھ) کو ندوہ کے سالانہ جلسہ منعقدہ پٹنہ میں شرکت کے ارادہ کی اطلاع مولانا آزاد کے ایک خط بنام مولوی عبدالرزاق کانپوری سے ملتی ہے جہاں جلسہ میں شرکت کے علاوہ کتب خانوں کے دیکھنے کا بھی خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا عبدالرزاق کانپوری کو انھوں نے تحریر کیا تھا:

> "پٹنہ کی بابت جو کچھ آنجناب نے تحریر کیا ہے بجا ہے! ۱۱ر رجب المرجب کو میں پٹنہ جاؤں گا کیوں کہ ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہے۔ اس لیے وہاں کے کتب خانہ کی بھی سیر ہو جائے گی اگر تصنیفات غزالی مل گئیں دیکھ لی جائیں گی انشاءاللہ تعالیٰ[۱۷]"

۱۹۰۱ء کی ابتدا میں ندوہ کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہوا تھا جس کی مخالفت مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے "جدوہ" کی بنیاد ڈال کر اور چھوٹے چھوٹے رسائل لکھ کر کی۔ مولوی نظام الدین جھجری جو ندوہ کے سفرا میں سے تھے ایسے رسائل مولانا آزاد کے پاس لے آتے تھے۔ مولانا آزاد ان کے جواب تحریر کر دیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے مولانا آزاد سے دو تین رسائل لکھوا کر شائع کرائے[۱۸]

---

[۱۷] مکاتیب ابوالکلام آزاد: ابوسلمان شاہجہانپوری ص ۷۔

[۱۸] ارمغان آزاد: ابوسلمان شاہجہانپوری ص ۱۰۶/ آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی: ملیح آبادی ص ۲۷۴

۱۹۰۲ء کی آمد کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد کی پہلی تصنیف "اعلان الحق"
۵ جنوری کو طباعت کی منزل سے گزر کر منظر عام پر آئی اس کی اشاعت کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ ان کے والد مولانا خیر الدین کے خلاف لوگ طرح طرح سے آواز بلند کرنے لگے تھے اور اتہام تراشی سے بھی باز نہیں آرہے تھے بلکہ نہایت سخت الفاظ ان کی شان میں استعمال کر رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے نہایت صبر وضبط اور عالمانہ وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے اعتراضات کے جواب دئے۔ کتاب کے شروع میں مولانا آزاد نے اس دور کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے :

"آج کل زمانہ میں عجیب عجیب پُر آشوب فتنے اٹھا کرتے ہیں، طرح طرح کے شگوفے چھوٹتے ہیں مسائلِ کاسدہ اور اعتقادِ فاسدہ کی اس قدر شہرت عام ہے کہ ہر خواندہ ناخواندہ مجتہدِ وقت اور امام ہے۔ عجب دور ہے، طرفہ طور ہے نئے نئے گل پھولے ہیں، لوگ اپنی پرانی روش بھولے ہیں، دین میں قسم قسم کے جھگڑے نکالتے ہیں، اسلام میں فساد کے رخنے ڈالتے ہیں۔ تعصب کی گھٹا چار طرف چھائی ہوئی ہے، جہالت کا طوفان جوش زن ہے ایک لکھا نہ پڑھا فاضل مشہور ہے۔ دوسرا دو حرفی لیاقت کے نشہ میں چور ہے۔ ایک اچھے کو بُرا، بُرے کو اچھا بتاتا ہے دوسرا نام آوری اور شہرت کے لیے مذہب پر چھری پھیرتا ہے ایک نے تمام جہاں کو مشرک و بدعتی قرار دیا ہے دوسرے نے تمام کتب فقہ کو طاق نسیان پر رکھ کر نئی تحقیق اور نئے اجتہاد کا

سبق یاد کیا ہے[۵۹]

یہ بات بھی قابل توجہ اور مولانا آزاد کے بہتر مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ۱۹۰۳ء میں پندرہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے مولانا آزاد اپنے موروثی عقاید پر قانع نہ رہ سکے تھے ان کی فکر میں صحتمند تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوگئی تھی اور وہ نئے سرے سے اپنا راستہ بنانے اور اسے طے کرنے کی طرف رجوع ہوگئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا، لیکن میں موروثی عقاید پر قانع نہ رہ سکا، میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی نئی راہیں ڈھونڈھنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہوگئی تھی اور موروثی عقاید جس شکل و صورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی[۶۰]"

یہی وہ زمانہ ہے جب وہ تازہ تازہ طالب علمی کی زندگی سے فارغ ہوئے تھے اس وقت انھیں سرسید سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور ان کے مضامین

---

۵۹ اعلان حق: ابوالکلام آزاد: سہ ماہی تحریر، دہلی مرتبہ مالک رام ۱۹۶۸ء شمارہ جلد ۲ ص ۳۔

۶۰ غبار خاطر، ابوالکلام آزاد: مرتبہ مالک رام ص ۳۸

پڑھنے کا شوق تیز ہو چکا تھا جس کی وجہ سے جدید تعلیم سے متعلق ان پر سرسید کے خیالات کے اچھے اثرات مرتب ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مولانا تحریر کرتے ہیں:

"اس کے تھوڑے ہی دن بعد سرسید احمد خاں کے مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا جدید تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات کا میرے اوپر بہت اثر ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ جب تک کوئی شخص جدید سائنس، فلسفہ اور ادب کا اچھا مطالعہ نہ کرے وہ صحیح معنوں میں تعلیم حاصل نہیں کرتا۔ میں نے طے کیا کہ میرے لیے انگریزی پڑھنا ضروری ہے۔ مولوی محمد یوسف جعفری سے میں نے اس کا ذکر کیا۔ وہ اس زمانے میں مشرقی علوم کے صدر ممتحن تھے۔ انھوں نے مجھے انگریزی کی ابجد سکھائی اور پیارے چند سرکار کی "پہلی کتاب" پڑھنے کو دی۔ جیسے ہی مجھے زبان کی کچھ شدبد ہو گئی۔ میں نے انجیل پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے انگریزی، فارسی اور اردو کے نسخے حاصل کیے اور تینوں کو سامنے رکھ کر پڑھتا تھا۔ اس سے مجھے عبارت کے سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ میں نے انگریزی لغت کی مدد سے اخبار پڑھنا بھی شروع کر دیا اور بہت جلد اس قابل ہو گیا کہ انگریزی کتابیں پڑھ سکوں میں تاریخ اور فلسفہ کا خاص طور سے مطالعہ کرتا رہا[۲۱]۔"

۲۱۔ ہماری آزادی، ابوالکلام آزاد مترجمہ محمد مجیب ص ۱۱

سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالیؔ اور شبلی نعمانی کے جو اثرات مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن اور دماغ پر مرتب ہو رہے تھے ان کا اظہار "لسان الصدق" کے صفحات پر ملتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ آزاد مولانا شبلی کے بہت قریب ہوتے گئے۔ چنانچہ اب بار بار مولانا شبلی سے ملاقاتوں اور مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کا موقع ملتا تھا۔ شبلی بھی مولانا آزاد کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور جانتے تھے کہ ان سے بہتر کام لیا جاسکتا ہے چنانچہ جیسے ہی اپریل مئی ۱۹۰۵ء میں "لسان الصدق" بند ہو گیا اور مئی ۱۹۰۵ء کے بعد شبلی سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے آزاد کو لکھنؤ آنے کی پُرزور دعوت دی۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> "ایک دن (مولانا شبلی) میرے یہاں بیٹھے تھے اور کتابوں کی الماریوں سے کتابیں نکال نکال کر دیکھ رہے تھے۔ اس میں "خدنگ نظر" کا ایک مجموعہ نکل آیا اس میں میرے مضامین بھی تھے۔ پڑھ کر انھوں نے بہت زیادہ اصرار کیا۔ اس میں ایک مضمون اکس ریز کی ایجاد و حقیقت پر تھا۔ انھوں نے کہا جب تم ایسے مضامین لکھ سکتے ہو تو کیوں اس طرح بلا کسی مشغلے کے ہو؟ کم سے کم ایک مضمون الندوہ کے ہر نمبر کے لیے لکھ دیا کرو[۲۲]"

خطوط کے ذریعہ بھی وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے رہے، چنانچہ مولانا آزاد جو پہلے سے مولانا شبلی کے معتقد اور دارالعلوم ندوہ کے قدرداں تھے

۲۲۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: ابوالکلام آزاد: بروایت ملیح آبادی ص ۳۱۱ ۔ ۳۱۲

اس کے ماہنامہ الندوہ کی اہمیت اور ضرورت سے آگاہ تھے اور خود علمی ادبی کاموں سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے بلکہ اس سلسلے میں بے چین دل پایا تھا لکھنؤ کا رخ کرتے ہیں اور ندوہ میں مولانا شبلی کے ساتھ قیام کرتے ہیں ۔ مولانا شبلی الندوہ کی ادارت میں شامل کرتے ہیں اور آزاد ان کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے الندوہ کے کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیتے ہیں، لیکن یہ سلسلہ چھ ماہ سے زیادہ نہیں رہا یعنی اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک وہ اس رسالہ کی ادارت میں شامل رہے ۔

نیرنگِ عالم اور ''المصباح'' کے مختصر مدّت کے لیے نکالنے اور ''خدنگ نظر'' کی چند ماہ کے لیے اسسٹنٹ اڈیٹری قبول کرنے کے بعد صحافت سے آزاد کا تعلق اور گہرا ہو گیا بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ادبی صحافت کا رنگ ان پر غالب آنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنا ایک ماہنامہ ''لسان الصدق'' اپنے سوچے سمجھے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے نکالا جس نے یقیناً مختصر عمر پائی لیکن مولانا آزاد کی زندگی پر دیرپا اثرات چھوڑے نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ انھیں اپنی زندگی کی راہ کے تعین میں اور مستقبل کی منزل انتخاب کرنے میں کافی آسانی ہوئی۔ ''لسان الصدق'' نے دنیائے اردو کے سامنے جس مدیر محترم کو لا کھڑا کیا اور جس طرح ان کا تعارف کرایا اس نے اُردو کی اس وقت کی معتبر شخصیتوں کو حیرت میں ڈال دیا اور ابوالکلام آزاد کا گرویدہ بنا دیا۔ ایسے ہی لوگوں میں حالیؔ، شبلی اور مولوی عبدالحق وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدیر لسان الصدق کی حیثیت سے وہ مختلف جلسوں، کانفرنسوں میں شریک ہونے لگے اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے اردو دنیا کو اپنے خیالات اور اندازِ فکر سے آگاہ اور متاثر کرنے لگے۔

مولانا شبلی ان کی صلاحیتوں کے بے حد قدرداں تھے ان سے بار بار "الندوہ" کے لیے مضمون لکھنے کی خواہش کرتے تھے اور لکھنؤ آنے ندوہ میں قیام کرنے اور الندوہ کی ادارت میں شامل ہونے کی دعوت دیتے تھے اور آزاد جو شبلی کی عظمتوں کے معترف اور شفقتوں کا احساس رکھتے تھے دار العلوم ندوہ میں قیام کے لیے راضی ہوگئے اور الندوہ کی ادارت میں شامل ہونے کے لیے تیار بھی ہوگئے۔ چنانچہ انھوں نے چند ماہ ندوہ میں قیام کیا اور چھ ماہ تک الندوہ کی اسسٹنٹ اڈیٹری کے فرائض انجام دیئے۔

اس کے بعد وہ الندوہ سے الگ ہوجاتے ہیں لیکن کیوں الگ ہوئے یہ بات اب تک راز ہے۔ البتہ اس مختصر مدت نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو محترم اور معتبر بنانے میں بڑی مدد کی۔ اب وہ ہندوستان گیر شہرت کے مالک ہوچکے تھے اور اپنی علمی صلاحیتوں سے وسیع حلقہ کو اپنا گردیدہ اور قدرداں بنا چکے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی شیخ غلام محمد مالک "وکیل" ہفتہ وار (امرتسر) کو آزاد کی الندوہ سے علیحدگی کی خبر ملی۔ انھوں نے "وکیل" کی ادارت سنبھالنے کی دعوت بھیج دی اور آزاد نے دعوت قبول کر لی۔ اس وقت مولانا آزاد کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ وکیل جیسے بڑے اخبار کی ادارت کرنی آسان نہ تھی لیکن "لسان الصدق" اور الندوہ کے تجربوں نے ان میں ہمت بھی پیدا کر دی تھی اور بڑے اخبار کو سنبھالنے کی صلاحیت بھی عطا کر دی تھی۔

چنانچہ مولانا آزاد نے وکیل کو ہفتہ میں دو بار کے بجائے تین بار نکالنا ہی شروع نہیں کیا بلکہ اسے ہر وقت نکالنے پر قابو پا لیا لیکن ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ کلکتہ میں مولانا آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر آہ

کا ستمبر ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوگیا، جس کا اثر مولانا آزاد پر تو پڑا ہی لیکن ان کے والد مولانا خیرالدین، اس صدمہ سے نڈھال سے ہوگئے، بڑے بیٹے ہونے کی وجہ سے آہؔ سے جو محبت اور ان کی جو اہمیت ہونی چاہئے تھی وہ تو تھی ہی اس سے ہٹ کر ان کے مذہبی رنگ کی وجہ سے مولانا خیرالدین ان کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اس حادثے نے سب کچھ درہم برہم کردیا۔ ایسی حالت میں ایک شخص کو امرتسر بھیج کر مولانا ابوالکلام آزاد کو انھوں نے کلکتہ بلایا۔ آزاد بھی اپنے بڑے بھائی کی وفات سے رنج وغم میں مبتلا تھے۔ خط پاتے ہی کلکتہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس طرح وکیل سے ان کا تعلق سات ماہ کر ٹوٹ گیا۔

کلکتہ پہنچنے پر ان کے والد مولانا خیرالدین نے انھیں اپنا جانشین مقرر کیا اور یہ طے کیا کہ اب وہ کلکتہ ہی میں قیام کریں گے۔ ان کے احباب اور ملنے والوں نے بھی زور دیا کہ اب وہ کلکتہ نہ چھوڑیں اس لیے کہ ابوالنصر آہ کے بعد آزاد کی موجودگی اور زیادہ ضروری تھی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۰۶ء کے آخری ایّام میں یا ۱۹۰۷ء کے ابتدائی مہینوں میں مولانا آزاد کی شادی ان کے والد مولانا خیرالدین نے اپنے عزیز ترین مرید مولوی آفتاب الدین کی چھوٹی صاحبزادی زلیخا بیگم سے اسی غرض سے کردی کہ مولانا آزاد کلکتہ سے باہر جانے کی نہ سوچیں۔

مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کو جاری رکھنے کے لیے یہ کوشش بھی کی گئی کہ کلکتہ کا ہفت روزہ "دارالسلطنت" جو بند ہوگیا تھا دوبارہ جاری ہوجائے اور مولانا آزاد اس کی ادارت میں شامل ہوجائیں چنانچہ

مولوی محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی نے مولوی عبداللطیف مالک ہفت روزہ " دارالسلطنت" کو مشورہ دیا کہ وہ اسے دوبارہ جاری کریں ان سے مولانا آزاد کا تعارف بھی کرایا۔ ان کی صحافتی صلاحیتوں سے آگاہ بھی کیا اور اس رسالہ کو ان کی ادارت میں دے دینے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں طے ہوا کہ مولانا آزاد کی ادارت میں " دارالسلطنت" وسطِ جنوری ۱۹۰۷ء سے جاری کیا جائے۔ اسی فیصلہ کے تحت مولانا آزاد نے اپنے مختلف احباب کو اس ہفت روزہ کے سلسلے میں خطوط لکھے اور مضامین کی فرمائش کی۔

پروگرام کے مطابق مولانا آزاد اس کی ادارت میں شامل ہوئے اور چند ماہ اسے نکالنے میں کامیاب بھی ہوئے لیکن اس کے مالک سے بعض باتوں میں اختلاف ہونے کی وجہ سے ۱۵ رمئی ۱۹۰۷ء سے قبل چار ماہ کے اندر ہی اس سے الگ ہو گئے۔

جیسے ہی ہفتہ دار " وکیل" امرتسر کے مالک کو مولانا آزاد کی " دارالسلطنت" سے علیحدگی کی اطلاع ملی وہ دوبارہ انھیں " وکیل" کی ادارت میں شامل کرنے کے لیے کوشاں ہو گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ مولانا آزاد چونکہ " وکیل" کی ادارت میں رہ چکے تھے اس لیے دوبارہ شمولیت میں دقت نہیں ہوئی۔ وہ اگست یا ستمبر ۱۹۰۷ء میں امرتسر گئے۔ اس بار مولانا آزاد کے ساتھ عبداللہ عمادی بھی تھے۔

اس وقت تک مولانا آزاد کے سیاسی شعور میں تبدیلیاں آنا شروع ہو چکی تھیں۔ اب وہ ہندوستان کی آزادی کے نہ صرف خواہشمند تھے بلکہ اس کے لیے اپنے قلم سے فضا ہموار کرنا چاہتے تھے گویا اس طرح وہ

حصولِ آزادی کی لڑائی میں باضابطہ حصّہ لینا چاہتے تھے اور اپنی صحافتی زندگی کو جنگ آزادی کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے، لیکن "وکیل" کا میدان اس کام کے لیے محدود ثابت ہوا، اس لیے آزاد کو ایک بار پھر اُس سے الگ ہونا پڑا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۰۸ کو وہ دوبارہ اس اخبار سے قطع تعلق کرکے بھوپال چلے آئے۔ یہاں انھوں نے اپنی بہن آبرو بیگم کے یہاں قیام کیا۔ پھر کچھ دنوں کے لیے پونا چلے گئے۔ وہاں کی آب و ہوا ان کی صحت کے لیے اچھی ثابت ہوئی۔

ابھی چند ہی دن پونا میں قیام کیا تھا کہ اپنے والد مولانا خیرالدین کی علالت کی خبر پاکر کلکتہ لوٹ آئے۔ والد سے ملاقات ہوگئی۔ انھیں ہوش و حواس میں پایا۔ لیکن دوسرے ہی دن ۱۶ اگست ۱۹۰۸ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

والد کے انتقال کے بعد مولانا آزاد بہت سی فکروں اور پابندیوں سے آزاد ہوگئے۔ اب انھوں نے بیرونِ ہند جانے کا اور اسلامی دنیا کی سیر کا فیصلہ کیا اور ستمبر ۱۹۰۸ء[۱۲] یا اس کے بعد سفر کے لیے روانہ ہوگئے اور پہلے عراق پہنچے اور وہاں کے انقلابیوں سے ملاقات کی مصر میں مصطفیٰ کامل[۱۳] کے

---

[۱۲] مولانا آزاد اس سفر سے متعلق تحریر کرتے ہیں: "میری عمر بیس[۲۰] اکیس[۲۱] برس کی ہوگی۔ عہدِ شباب کے ولولوں سے دل کا ایک ایک ریشہ معمور تھا۔ جس منظر کو دیکھتا تھا جنت نگاہ تھا۔ جس نوائے ہستی کو سنتا تھا فردوس گوش تھی۔ عراق کے قیام کے یہ چند مہینے اب چند لمحوں سے زیادہ محسوس نہیں ہوتے۔ (کاروانِ خیال ص ۷۳)

[۱۳] غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ مصطفیٰ کامل کے پیرووں سے ملاقات ہوئی تھی۔

بیرونوں سے ملے۔ ترکی میں ینگ ٹرکس کے رہنماؤں سے تعلقات پیدا کیے۔ ہندوستان واپس آنے پر بھی عرصہ تک ان سے خط وکتابت کے ذریعہ تعلقات قائم رہے۔

اس سفر سے واپسی کے بعد جب مولانا آزاد ۱۹۰۹ء میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے دل میں سیاسی جدوجہد اور جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کا حوصلہ اور زیادہ بلند ہوتا ہے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کی جائے تاکہ وہ جنگِ آزادی میں بھرپور حصّہ لے سکیں۔ اپنے خیالات کو عوام تک پہنچانے اور ان میں سیاسی شعور اور بیداری پیدا کرنے کے لیے ایک اچھے اخبار کی انھیں ضرورت محسوس ہوئی؛ ایسی بات نہ تھی کہ اس زمانے میں اخبارات کی کمی تھی؛ پنجاب اور یوپی سے کئی روزنامے، ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہنامے شایع ہوکر عوام تک پہنچ رہے تھے۔ لیکن مولانا آزاد کو نہ تو ان کی چھپائی پسند تھی، نہ مواد کے اعتبار سے وہ مولانا کے معیار کے مطابق ہوتے تھے اور چونکہ پتھر کی چھپائی ہوتی تھی اس لیے صحافت کے جدید تقاضوں کو بھی پورا نہیں کرسکتے تھے۔ نہ تصویریں اچھی چھپ سکتی تھیں نہ ہی ترتیب میں حسن پیدا کیا جاسکتا تھا۔

چنانچہ مولانا آزاد نے طے کیا کہ وہ ایک ایسا اخبار نکالیں جس کی خوبصورت چھپائی ہو اور اچھی ترتیب بھی ہو اور جس کی مشمولات ایسی ہوں جو ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ بیدار کرنے میں مدد کریں۔ انھوں نے ٹائپ میں اخبار چھاپنے کا اس لیے فیصلہ کیا تاکہ تصاویر بھی شامل کی جاسکیں اور ترتیب وتزئین میں بھی انفرادیت اور

حسن پیدا کی جا سکے۔

حالانکہ اگر مولانا آزاد چاہتے تو وہ اپنے والد کے خواہش کے مطابق ان کے بنائے ہوئے راستے پر چل نکلتے اور پیری مریدی اختیار کر لیتے، رشد و ہدایت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر لیتے اور مذہبی رہنما کی حیثیت سے مریدوں کے ہجوم میں گھرے رہتے۔ لیکن انھوں نے ایسا ہونے نہیں دیا، بلکہ قدرت سے جو صلاحیت لے کر آئے تھے اور جس جذبے اور ہمت کے وہ امانت دار بنائے گئے تھے اس کو بروئے کار لانے کے لیے عمل پیرا ہوئے۔

مولانا آزاد نے ۱۹۰۸ء میں مصر، ترکی اور عراق کے لیے ہندوستان سے باہر سفر کیا تھا اس سے کچھ پہلے ہی وہ بنگال کے انقلابی رہنما شیام سندر چکرورتی سے مل چکے تھے اور ان کو اپنے انقلابی ذہن رکھنے کا یقین دلا چکے تھے۔ اگرچہ اس گروہ میں شمولیت سے پہلے اس جماعت کے لوگ مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ مسلمان آزادی نہیں چاہتے اور انقلابیوں کی مخالفت کرتے ہیں، مولانا آزاد کی اس گروہ میں شمولیت کی وجہ سے انھیں خوشی ہوئی۔ ان کی مسلمانوں سے متعلق غلط فہمی بھی دور ہوئی، لیکن مولانا آزاد انقلابیوں کے ساتھ زیادہ کام نہیں کر سکے تھے کہ انھیں اسلامی ممالک مصر، عراق، ترکی کے سفر کے لیے ستمبر ۱۹۰۸ء یا اس کے بعد نکلنا پڑا۔ اس سفر میں ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ وہاں عراقی انقلابیوں، مصطفیٰ کامل پاشا کے ماننے والوں اور ینگ ٹرکس کے لیڈروں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے تبادلہ خیال ہوا۔ مولانا آزاد بیان کرتے ہیں:

"عرب اور ترک انقلابیوں سے تعلقات ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے سیاسی عقاید راسخ ہوگئے۔ ان انقلابیوں کو اس پر حیرت ہوتی تھی کہ ہندوستانی مسلمان قومی مطالبوں کی طرف سے بے اعتنائی اور سرد مہری برتتے ہیں یا ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کی جنگ میں ہراولوں اور رہبروں کا کام کرنا چاہیئے تھا نہ کہ انگریزوں کے بہیر بن کر رہ جانا[۲۴]"

چنانچہ اس سفر سے واپسی کے بعد وہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ حصول آزادی کی جنگ میں مصروف ہوگئے۔ وہ انقلابیوں[۲۵] سے بھی ملتے رہے اور اپنی موجودگی سے اس تحریک کو تیز کرتے رہے اور بنگال سے نکل کر اس تحریک کو دوسرے حصوں میں بھی پھیلانے کی کوشش کرتے رہے اسی کے ساتھ ایک بامقصد اخبار جاری کرنے کی تگ و دو میں رہے۔ اسی زمانے میں مولانا آزاد اکثر ندوہ کے جلسوں میں شرکت کرنے لگے تھے۔ جہاں مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور سید سلیمان ندوی کی محفلیں جمتی تھیں۔

۲۶، ۲۷، ۲۸ مارچ ۱۹۱۰ء کو ندوہ کا سالانہ اجلاس عربک کالج کے میدان میں منعقد ہوا، جس کی صدارت حکیم اجمل خاں نے کی۔ دور دورے

---

[۲۴] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد مترجمہ محمد مجیب ص ۲۰

[۲۵] بعض تحریروں میں شیام سندر چکرورتی سے ملنے کا زمانہ ۱۹۰۵ یا ۱۹۰۶ء بتایا گیا ہے جو میرے نزدیک درست نہیں ہے اس زمانے میں آزاد کی مصروفیات دوسری تھیں۔ عبدالقوی دسنوی

اہل علم اور ندوہ کو عزیز رکھنے والے حضرات اس میں شریک ہوئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ایک موقع پر نہایت اچھی تقریر کی تھی جس کی تعریف کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

"مولانا ابوالکلام نے بھی اس اجلاس میں بہت پُرزور تقریر کی تھی جس کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب تک ہے"۔[۵]

ندوہ میں ۱۹۰۹ء ہی سے علامہ شبلی نعمانی کے خلاف منشی احتشام حسین، مولوی خلیل الرحمٰن اور کسی قدر مولانا عبدالحی کے دل میں یہ بات پیدا ہوگئی تھی کہ وہ انھیں نمایاں ہونے نہیں دیتے بلکہ وہ کام جوان کے کرنے کا ہے اسے بھی وہ کر کے نمایاں ہوگئے ہیں۔ مولانا شبلی اُن حضرات کے اس عمل سے بے حد پریشان تھے انھوں نے جہاں مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کو ان حالات سے آگاہ کیا اور ان سے مشورہ کے خواہشمند ہوئے وہاں مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی خط لکھا:

"آج کل سخت نرغہ ہے، سہارنپوری، شاہجہانپوری، پھلواروی۔ کاکوروی سب یکجا جمع ہیں۔ رپورٹیں تیار ہورہی ہیں، مضامین لکھے جارہے ہیں، فردقرار داد جرم مرتب ہورہی ہے بلکہ ہوچکی ہے۔ اقرارنامہ عقاید تیار ہوگیا ہے جس کا مجھ سے اعتراف کرایا جائے گا اور ان سب کاموں کے چیف ایڈیٹر جناب شاہ صاحب ہیں، جناب موصوف نے یہاں مستقل قیام اختیار کیا ہے۔"

---

[۵] حیات شبلی: سید سلیمان ندوی ص ۴۹۹

تمام کاغذات ارکان کے پاس بھیجے جائیں گے اور باضابطہ
میرے نکالنے کی تحریک کی جائے گی ۲۶"

دراصل مولانا شبلی اور آزاد کے تعلقات ایک دوسرے کے لیے محبت، عقیدت، احترام اور خلوص کی وجہ سے تھے۔ اس لیے ہمیشہ قائم رہے اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے، کبھی شبلی کلکتہ بلائے جاتے کبھی ابوالکلام آزاد لکھنؤ پہنچتے، کبھی بمبئی میں قیام ہوتا اور علمی ادبی کاموں کے نقشے جتنے مشورے ہوتے، عملی اقدام کیے جاتے۔

لیکن مولانا ابوالکلام آزاد، علمی، ادبی کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی سے کبھی غافل نہیں رہتے خاص طور سے ۱۹۱۰ء کا زمانہ ایسا تھا جس میں آزاد، ہندوستانی مسلمانوں کی عملی سیاست سے دوری اور جنگ آزادی سے علیٰحدگی کی وجہ سے فکرمند رہتے تھے اُن کی دلی خواہش تھی کہ اس جدوجہد میں مسلمانوں کی اکثریت بڑھ چڑھ کر حصّہ لے۔

۱۹۰۵ء کے تقسیم بنگال کی وجہ سے ہندوستانی سیاست میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی تھی اور اس کے خلاف مسلسل جدوجہد کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کر رہے تھے۔ یہاں تک ۱۹۰۷ء میں انقلابی جماعت شیام سندر چکرورتی اور دوسرے رہنماؤں کی قیادت میں تیار ہوگئی تھی جس کی وجہ سے آزادی کی جنگ تیز تر ہوگئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ۱۹۱۱ء میں اُسے تنسیخ کرنے پر مجبور ہوئی۔ یہ انگریزوں کے خلاف متحد ہوکر

۲۶ھ نمودِ ہستی: سید محمد حسنین ص ۴۷،

جنگ کرنے میں ہندوستانیوں کی پہلی فتحمندی تھی۔ مولانا آزاد بھی اس کامیابی پر بہت خوش تھے۔ جس کا اظہار انھوں نے "الہلال" جلد ا شمارہ ۳ کے شذرات میں کیا تھا۔

یہ زمانہ مولانا آزاد کی باضابطہ سیاست میں دلچسپی لینے کا تھا۔ وہ ایک محب وطن کی حیثیت سے اس میدان میں اترے تھے۔ یہ جذبہ ان کے یہاں "لسان الصدق" کے اجراء کے زمانے سے سر اٹھا رہا تھا۔ وکیل (امرتسر) سے تعلق، مصر و شام کے سفر، انقلابی جماعتوں سے مصر و شام اور ترکی میں ملاقاتیں، ان کے والد مولانا خیرالدین کی وفات، ان سب نے مل کر انھیں پوری طرح سے سیاست کے میدان میں جدوجہد کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ موقع کی تلاش میں تھے ہی ۱۹۱۱ء نے حالات اور مواقع فراہم کر دئے۔ مولانا آزاد رقمطراز ہیں:

"۱۹۱۱ء میں جبکہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا مجھے موقع ملا کہ اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک مذہب قرار دوں۔ خدمت ملک و ملت کے دشت ناپید اکنار کی طرف قدم اٹھائے ہوئے اصول عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے ..... میں نے جو اپنے لیے راہ عمل منتخب کی تھی وہ دعوت و تبلیغ کی راہ تھی موجودہ زمانے کی مصطلحہ لیڈرشپ کی راہ نہ تھی[۲۷]"

۲۷؎ ابوالکلام کی صحافت: خواجہ مقبول احمد: آزاد نمبر اردو ادب علی گڑھ ص ۲۰۵

مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے ۱۹۱۲ء کا سال اس لیے اہم ہے کہ وہ اسی سال اپنا مشہور ہفتہ وار "الہلال" کلکتہ سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ جس نے اُردو صحافت کا وقار بنایا، ہندوستانی سیاست میں ہلچل، تیزی اور شدّت پیدا کی اور جنگ آزادی کو فتح و نصرت کی حدود کے قریب لانے میں مدد کی۔

اخبار جاری کرنے کی یہ آرزو مولانا آزاد کے دل میں ۱۹۰۶ء میں جب وہ وکیل امرتسر کے ادارے میں شامل تھے پیدا ہوئی تھی۔ چھ سال کی مدت میں یہ نہ کم ہوئی، نہ ختم ہوئی، بلکہ بڑھتی گئی، شدّت اختیار کرتی گئی اور مولانا آزاد کو اس وقت تک مضطرب کرتی رہی جب تک اس کو نکالنے میں کامیاب نہ ہو گئے۔

مولانا آزاد کی ذہنی تعمیر، سیاسی شعور کی تربیت اور علمی، ادبی ذوق و شوق میں تیزی اور پائیداری اور جدید عربی زبان و ادب اور اس پر دسترس پانے میں مولانا شبلی اور ندوہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے جس کا اظہار اور اعتراف خود مولانا آزاد نے بارہا کیا ہے۔ مولانا شبلی کی ذاتی توجہ اور تربیت کے ساتھ ساتھ ندوہ کا ماحول، جلسوں اور تقاریب میں

شرکت ۔ تقاریر اور مباحثے سے دلچسپی اور عربی و اُردو کے مختلف رسائل و اخبارات کے مطالعہ نے ان کی صلاحیتوں کو بہت جلد وہاں پہنچادیا جہاں پہنچنے کے لیے عام طور سے عام لوگوں کے لیے زمانہ چاہیئے ۔ مصروشام کے اخبارات نے مولانا میں جدید عربی زبان کے سمجھنے اور برتنے کی صلاحیت پیدا کی۔ اسلامی دنیا کے مسائل سے انھیں باخبر اور ان ملکوں کے عوام کی جدوجہد نے انھیں متاثر کیا۔ ندوہ ہی میں انھیں عربی کی نئی مطبوعات کے مطالعہ کا بھی موقع ملا۔ جس نے عربی زبان وادب کے مطالعہ کے ذوق دشوق کو تسکین بھی دی اور تشنگی بھی بڑھائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے دیکھتے مولانا آزاد عربی زبان میں تحریر و تقریر کی ایسی صلاحیت کے مالک ہوگئے کہ اہلِ علم معترف بھی ہوئے اور متحیّر بھی۔ اس سلسلے میں ۶ر اپریل ۱۹۱۲ء کو ندوہ کے اس جلسے کا جس کی صدارت رشید رضا مصری کر رہے تھے مولانا آزاد کی عربی دانی کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے ۔ ہوا یہ کہ جب رشید رضا مصری صدارتی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو مولانا آزاد کو اس کے ترجمے کی ذمہ داری سونپی گئی، چنانچہ انھوں نے برقت اور برجستہ فصیح اور رواں دواں اُردو میں ترجمہ کرکے سامعین کو حیرت میں ڈال دیا اور عش عش کرنے پر مجبور کیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اس جلسے میں موجود تھے بیان کرتے ہیں :

> مولانا ابوالکلام بھی سامعین میں تھے اصل تقریر کے معاً بعد انھوں نے اس کا ترجمہ ایسا رواں اور فرفر کردیا کہ اوروں کے ساتھ مولانا شبلی کو بھی حیرت ہوگئی ۲۵۔"

۲۵۔ معاصرین: مولانا عبدالماجد دریابادی ص ۱۸۶

اس واقعہ نے جہاں اہل علم کو متعجب اور مولانا آزاد کا قدرداں بنا دیا تھا وہاں مولانا آزاد کے دل میں اپنے آپ پر اعتماد اور اپنی صلاحیتوں پر اعتبار پیدا کر دیا تھا۔ اس کے تقریباً تین ماہ بعد ہی وہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے اپنا مشہور و معروف ہفتہ وار "الہلال" لیتھو کے بجائے ٹائپ میں نکالنے میں کامیاب ہوئے تو ان کے قدردانوں کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ شکل وصورت، ترتیب و تزئین، رنگ و آہنگ کے اعتبار سے یہ ہفتہ وار اس وقت کے تمام اُردو جریدوں میں بالکل مختلف اس وجہ سے بھی تھا کہ مولانا آزاد نے اسے جرجی زیدان مصری کے الہلال، رشید رضا مصری کے "المنار" اور جمال الدین افغانی اور عبدہ کے "العروۃ" کو سامنے رکھ کر نکالا تھا۔

مولانا آزاد اگر چاہتے تو اسے بہت پہلے ہی جاری کرنے میں کامیاب ہو جاتے لیکن انھوں نے جو اپنے لیے معیار اس ہفتہ وار کی طباعت، تزئین اور شمولات کے لحاظ سے طے کر رکھا تھا وہ اس سے نیچے اتر کر کسی کم معیاری ہفتہ وار نکالنے پر راضی نہیں ہوئے بلکہ کچھ دقت اور انتظار کرنا پسند کیا تاکہ اپنی دیرینہ آرزو پوری کر سکیں۔

چنانچہ پہلا شمارہ جیسے ہی منظر عام پر آیا، سب نے پسند کیا، اس کی تعریف و توصیف کی، حالانکہ اس میں ہندوستانی مسلمان یا ہندوستانیوں کے لیے کچھ نہیں تھا، نہ ان کے شب و روز کے مسائل تھے۔ نہ ماضی تھا نہ مستقبل کی نشان دہی کی گئی تھی بلکہ سرحد پار مصر، ترکی، بلقان و طرابلس کی باتیں تھیں۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ "الہلال" کچھ اس انداز سے آسمانِ اردو

صحافت پر طلوع ہوا کہ لوگ اسے دیکھتے رہ گئے اور اس کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ انھیں سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا کہ اس میں ان کے اپنے کتنے مسائل ہیں، جن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، بلکہ ہر طرف سے واہ واہ کا غلغلہ ہوا اور عام طور سے سبھوں نے تعریف و توصیف کی اس آواز میں اپنی آواز ملائی۔

لیکن ہمارے مسائل سے "الہلال" کے صفحات بہت دنوں تک خالی نہیں رہ سکے بلکہ چوتھے شمارہ ہی سے ہمیں ــــ "مسلم یونیورسٹی"، اور" مولانا نذیر احمد اور ٹرسٹیان علی گڑھ وغیرہ موضوعات سے متعلق تحریریں مطالعہ کو ملیں اور "الہلال" کی پولیٹیکل تعلیم واضح ہوتی نظر آئی اس طرح "الہلال" کے پہلے دور کے تقریباً تمام شماروں میں ایک مختصر حصہ "ہمارے مسائل" سے متعلق شایع ہوتا رہا جن میں مسلم یونیورسٹی کے علاوہ حسب ذیل موضوعات اہمیت رکھتے ہیں:

"مسلمانوں کا سچا لیڈر کون ہے؟ پنجاب کے نومسلم جو لڑکیوں کو ترکہ نہیں دیتے، ایک عظیم الشان اجتماع، مسلمانانِ بنگال کا قائم مقام جلسہ، مسٹر مظہر الحق کا استعفیٰ، شمس العلماء مولانا شبلی اور مسئلہ ندوہ، اردو پریس علی گڑھ کی ضمانت، مسلمانانِ ہند اور گورنمنٹ کی حکمتِ عملی۔"

مارچ ۱۹۱۳ء سے انتقاد کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے شمارہ سے حصہ نظم میں فکاہات پر نظر پڑتی ہے۔ نظمیں اور غزلیں بھی مطالعہ کو ملتی ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلقات اس وقت

سے بہت پہلے گہرے ہوگئے تھے جب مولانا آزاد الندوہ کی مجلس ادارت میں شامل ہوکر لکھنؤ میں مقیم تھے۔

چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جب "الہلال" جاری کیا تو انھیں علامہ سید سلیمان ندوی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مولانا آزاد نے سید صاحب کو خط لکھ کر الہلال کے اسٹاف میں شامل ہونے کی دعوت دی اور سید صاحب یہ دعوت قبول کر کے کلکتہ آگئے اور الہلال کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے۔ لیکن ابھی مولانا سید سلیمان ندوی کو الہلال سے متعلق ہوئے تین مہینے ہی ہوئے تھے کہ مسجد کانپور کا خونی واقعہ پیش آیا جس نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں حکومتِ برطانیہ کی پالیسی کے خلاف ایک خاص اضطراب اور جوش پیدا کر دیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ کانپور کے مچھلی بازار محلے میں ایک مسجد عین راستے پر تھی، جب شہر کی میونسپلٹی نے سڑک کی درستی کی تو مسجد کا وہ حصہ جو وضو کے لیے استعمال ہوتا تھا اور درمیان میں آگیا تھا، مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود ڈھا دیا گیا، جس سے مسلمان مشتعل ہوگئے۔ ۳۱ر اگست ۱۹۱۳ء (۱۰ رمضان المبارک) کو مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی مدرس اعلیٰ مدرسہ الٰہیات کانپور کی سربراہی میں ایک جلسہ ہوا اس کے بعد مسلمان بوڑھے، بچے، جوان مسجد کی طرف بڑھے اور شکستہ حصّہ پر اینٹ چن چن کر رکھنے لگے۔ اس منظر کو دیکھ کر ٹیلر (ڈپوٹی کمشنر کانپور) نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ نتیجے میں کئی شہید ہوگئے۔ جس کی وجہ سے سارے ہندوستان کے مسلمان غم و غصّہ سے بلبلا اٹھے۔

الہلال کلکتہ میں اس حادثہ سے متعلق پرجوش اور ولولہ انگیز تحریریں شائع ہوئیں اس لیے کہ خود مولانا آزاد اس واقعہ سے بے حد رنجیدہ تھے۔

بعد میں انھیں کی کوششوں سے یہ حادثہ اہم فیصلہ تک پہنچ سکا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جب الہلال جاری کیا تو اسے ایک "دعوت" کہہ کر پکارا اور اعتماد کے ساتھ کہا:

" الہلال بھی ایک دعوت ہے جس کے تمام اغراض و مقاصد اور اصول و فروغ کا نقطہ وحید صرف اس دین الٰہی کی تجدید اور اس کے اصولِ بنیادی "الامر بالمعروف و نہی عن المنکر" زندہ کرنا ہے۔"

اور اپنے اس اعلان پر انھوں نے عمل بھی کیا، نہ تو ان کو اس راہ پر چلنے میں ان کے محدود وسائل اور تنگ دامنی رکاوٹ بن سکی نہ حکومت وقت کی طاقت اور اس کے غیظ و غضب سے خوف زدہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردوئے معلّیٰ پریس علی گڑھ سے ضمانت طلب کی گئی تو وہ تڑپ گئے، اور بے اختیار حکومت وقت کے خلاف آواز بلند کی:

"..... چنانچہ رسالہ اردوئے معلّیٰ کے پریس سے یکایک تین ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی ہے اور چونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا فقیر بوریا نشین مالک تین ہزار کی جگہ دس روپے کے تین نوٹ بھی ایک وقت میں نہیں دے سکتا اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ پریس بند ہو گیا ۲۹؎"

۲۹؎ شذرات: اردو پریس علی گڑھ کی ضمانت: الہلال جلد ۲ شمارہ ۲۰، ۲۱ مئی ۱۹۱۳ء ص ۳۳۵

اس کے بعد الہلال ۲۸رمئی ۱۹۱۳ء کے شمارے میں بھی "اُردو پریس علی گڑھ کی ضمانت" پر اداریہ لکھا اور اس میں مولانا آزاد نے اپنی بے چینی اور اضطراب کا اظہار کیا جو حکومت کے اس رویہ سے ہوا تھا جو اس نے اردو پریس علی گڑھ کے خلاف اختیار کیا تھا۔ اس کے بعد "مسلم گزٹ"، لکھنؤ کے اڈیٹر کی علیحدگی نے انھیں بہت زیادہ فکرمند کر دیا تھا کہ خود "الہلال" سے ۱۸رستمبر ۱۹۱۳ء کو ضمانت طلب کرلی گئی، جس کی آخری تاریخ ۲۷رستمبر ۱۹۱۳ء رکھی گئی تھی لیکن مولانا آزاد نے ۲۳رستمبر ہی کو دو ہزار روپے داخل کر دئے اور اس کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کے افتتاحیہ مقالہ کی سرخی اس طرح قائم کی:

الہلال پریس کی ضمانت۔
ایک نہایت اہم خزینۂ مدافعت کی تاسیس۔
مجلس وفاع مطابع و جرائد ہندیعنی انڈین پریس ایسوسی ایشن۔
ذوق عصیاں کی افزایش تعزیر کے بعد۔
الہلال اور پریس ایکٹ

اسی مقالہ افتتاحیہ کے ذریعہ انھوں نے نہایت جرأت مندی سے الہلال پریس کی ضمانت کی طلبی اور اس کا جو کچھ خود مولانا ابوالکلام آزاد پر ردعمل ہوا تھا اسے بہت واضح طریقہ سے پیش کیا اور بتایا کہ "الہلال" جس دن سے نکلنا شروع ہوا ہے اسی دن سے اس کی ضمانت کی رقم جمع کرلی تھی، ان واقعات نے مولانا کے دل میں یہ خواہش پیدا کردی کہ کسی طرح انڈین پریس ایسوسی ایشن Indian Press Association کی بنیاد ڈالی جائے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ایسی متحدہ طاقتور انجمن کی

بنیاد ڈالی جائے جو تمام ہندوستانی پریس کے حقوق کی محافظت کرے۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ جیسے ہی "الہلال" کے قارئین کو اس کی خبر ملی کہ "الہلال" کی ضمانت طلب کی گئی ہے انھوں نے منی آرڈر سے مسلسل روپے بھیجنے شروع کردئے۔ لیکن مولانا آزاد شکریہ کے ساتھ واپس کرتے رہے۔ البتہ بعد میں انھوں نے اس خیال سے ایک فنڈ انڈین پریس ایسوسی ایشن کے لیے جمع کردیا، تاکہ ایک ایسی انجمن کا قیام عمل میں لایا جاسکے جس کے ذریعہ ہندوستانی پریس کے حقوق کی حفاظت ہوسکے۔ چنانچہ اس رقم سے پریس ڈیفنس فنڈ یعنی "خزینۂ دفاع حقوق مطابع" کی بنیاد ڈالنے کا فیصلہ کیاگیا۔

ایک ہفتہ بعد ۸ / اکتوبر ۱۹۱۳ء کو الہلال میں پھر "مجلس دفع مطابع وجرائد ہند" کی اہمیت پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی، جس سے معلوم ہوا کہ آزاد اس سلسلے میں سریندرناتھ بنرجی، بابوموتی لال گھوش ایڈیٹر امرتابازار پتریکا سے ملے اور انھیں اپنی تجویز سے آگاہ کیا۔ دونوں نے آزاد کی تجویز پسند کی اور پوجا کی تقریب کے باوجود اس کے جلسے میں شرکت کا وعدہ کیا۔ اس مجلس کا تعارف کراتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا تھا:

" جو عام اور وسیع ہو۔ جس میں بدبختانہ اور نامبارک تفریق نہ ہو جو ہندو مسلمانوں کے سوال کی صورت میں ہر جگہ پیدا کی جاتی ہے جس میں ملک کے ہر حصہ سے ارباب مطابع وجرائد شریک ہوں اور کوئی حصہ ایسا باقی نہ رہے

جہاں کے پریس کے قائم مقام اس میں نہ ہوں، پھر اس کا
ایک مرکزی مقام ہوا اور اس کی شاخیں تمام صوبوں میں
قائم ہو جائیں وہ بصورت آل انڈیا ایسوسی ایشن کے بھی
ہو اور بحیثیت پرونشیل جماعت کے بھی ؎"

چنانچہ انڈین ایسوسی ایشن ہال میں ۲/ اکتوبر (۱۹۱۳ء) کو دو بجے جلسہ رکھا گیا۔ یہ اعلان اگرچہ الہلال کی طرف سے تھا لیکن اس پر چار دوسرے بڑے لیڈروں کے دستخط تھے آنریبل سر بیندرناتھ بنرجی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ آئندہ جلسہ پوجا کے بعد نومبر (۱۹۱۳ء) میں کلکتہ میں ہوگا، جس میں تمام اہم مسائل زیر غور ہوں گے جلسہ کے انتظام و اہتمام کے لیے ایک کمیٹی مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل بنائی گئی:

۱	آنریبل بابو سر بیندرناتھ بنرجی	ایڈیٹر	بنگالی
۲	بابو کرشنو کمار متر	؍؍	سنجیونی
۳	بابو موتی لال گھوش	؍؍	امرتا بازار پترکا
۴	مولوی مجیب الرحمٰن	؍؍	مسلمان
۵	مولوی محمد اکرم	؍؍	محمدی
۶		؍؍	بھارت متر
۷	مولانا ابوالکلام آزاد	؍؍	الہلال

؎ مجلس دفاع مطابع وجرائد ہند: الہلال کلکتہ ۸/ اکتوبر ۱۹۱۳ء

مولانا ابوالکلام آزاد علامہ شبلی نعمانی کی زندگی میں کچھ اس طرح داخل ہوئے تھے کہ معمولی ملاقات نے گہرے تعلقات کی صورت اختیار کی اور یہ تعلق مضبوط علمی ادبی رشتہ بن گیا اب مولانا شبلی، مولانا سلیمان ندوی مولانا ابوالکلام آزاد بظاہر تین الگ الگ فرد تھے لیکن ذہنی، فکری اور نظریاتی اعتبار سے یہ سب ایک تھے۔ مولانا شبلی ہر معاملہ میں یا ہر نئی بات شروع کرنے سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے مشورہ کر لیتے تھے اور ان کا تعاون چاہتے تھے۔ یہی حال مولانا آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی کا تھا بات رائے تک ختم نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے بعد تعاون کا مرحلہ، پھر کامیابی کے لیے تگ و دو کی منزل پہنچتی اور ہر مرحلے میں یہ دونوں علامہ شبلی کی ہر خواہش کا احترام کرتے اور ان کی کامیابی کو اپنی کامیابی متصور کرتے۔ مولانا شبلی سے متعلق یہ معاملہ دارالمصنفین کا ہو یا کسی اور تصنیفی کام کا دونوں پیش پیش رہتے۔

دارالمصنفین کا خیال مولانا شبلی کے دل میں مارچ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ اگست ۱۹۱۰ء کے الندوہ میں انھوں نے لکھا تھا:

" ہماری تصانیف کی تو خیر کیا وقعت ہے ۔۔۔۔لیکن ہم

یہ چاہتے ہیں کہ دارالعلوم میں ایک عمارت دارالمصنفین کے نام سے تعمیر ہو جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تالیف و تصنیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے باقاعدہ تصانیف شایع ہوں۔

لیکن دارالعلوم میں حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ البتہ جب مولانا شبلی دارالعلوم ندوہ سے علیحدہ ہوئے تو انھوں نے مولانا آزاد کو آگاہ کیا کہ وہ سیرت کے دفتر کو بڑھا کر دائرۃ التالیف کی بنیاد ڈالنے کا خیال رکھتے ہیں۔

پھر ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء کے الہلال میں دارالمصنفین کی اہمیت اور ضرورت پر ایک تحریر شایع ہوئی تو مولانا آزاد نے اس پر نوٹ لکھتے ہوئے اپنے کتابی عطیہ کا اعلان کیا:

"اگر قابل اطمینان صورت اختیار کرے تو میں اپنا پرائیویٹ کتب خانہ جس میں تقریباً اکثر علوم اسلامیہ دعربیہ کا ذخیرہ ہے اور جس کی قیمت سات آٹھ ہزار روپیے سے کسی طرح کم نہ ہوگی وقف کر دینے کے لیے تیار ہوں"

مولانا شبلی کی خواہش تھی کہ اس کی بنیاد ندوہ میں ڈالی جائے، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی چاہتے تھے کہ حبیب گنج کا انتخاب ہو لیکن ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا تھا کہ مولانا شبلی کے بھائی محمد اسحٰق کا انتقال ۵ ر اگست ۱۹۱۴ء کو ہو گیا۔ جس نے مولانا شبلی کو بے انتہا رنجیدہ کر دیا اور انھوں نے اپنی بقیہ زندگی گزارنے کا فیصلہ اعظم گڑھ کے حق میں کیا اور بعد میں دارالمصنفین کی بنیاد وہیں پڑی۔

قیام اعظم گڑھ کے زمانے میں مولانا شبلی سیرت کی تکمیل میں مصروف ہوگئے، پھر وسط جون ۱۹۱۴ء میں بمبئی چلے گئے، جہاں پہلی جلد جب مکمل ہونے کو آئی تو انھوں نے اس کی طباعت کے سلسلے میں مولانا آزاد سے بھی مشورہ کیا۔

مولانا آزاد چاہتے تھے کہ اسے خوبصورت ٹائپ میں شایع کیا جائے اس لیے مولانا شبلی نے اس کا مقدمہ مولانا آزاد کو پہلے بھیج دیا۔ جسے انھوں نے ۲۲، ۲۹، اور ۵ فروری ۱۹۱۳ء کے "الہلال" میں شایع کیا تھا تاکہ اہل نظر سیرت النبیؐ کی طباعت کے سلسلے میں بہتر فیصلہ کر سکیں۔

مولانا شبلی سیرت النبیؐ کی تکمیل میں مصروف ہی تھے کہ ۷ر نومبر ۱۹۱۴ء کو پیچش میں مبتلا ہوئے۔ علاج شروع ہوا لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ مرض بڑھنے لگا تو سیرت کی تکمیل کا خیال انھیں پریشان کرنے لگا چنانچہ ۱۵ر نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا حمید الدین کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی تار دے کر بلایا۔ لیکن مولانا آزاد نہیں آسکے اس لیے کہ انھیں تار نہیں ملا، ان کے انتقال کے بعد مولانا آزاد نے الہلال میں دلی رنج کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا:

"نہایت رنج و افسوس کے ساتھ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی وفات کی خبر درج کی جاتی ہے۔ اس ماتم کے لیے صرف یہ موقع رنج و غم کافی نہیں کہ اس کے لیے "الہلال" کا ایک پورا نمبر بھی کافی نہ ہوتا لیکن اس وقت یہ رونا ہے کہ ہم دل کھول کر اس شہید علم کا ماتم بھی نہیں کر سکتے اس لیے اپنی

خوں نابہ فشانیوں کو دوسری فرصت کے لیے ملتوی رکھتے ہیں
دردرسیدوں کے ماتم کے لیے کوئی وقت محدود نہیں ہے[۳۰]"

مولانا شبلی کی وفات کے بعد مولانا آزاد دارالمصنفین سے بے تعلق نہیں ہوگئے تھے بلکہ اس کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ وہ اسے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا بدل دیکھنا چاہتے تھے ۲۷ر جنوری ۱۹۱۵ء کو اپنے مکتوب بنام مولانا سید سلیمان ندوی میں لکھتے ہیں:

" دارالمصنفین نہایت آسانی کے ساتھ ایک وسیع النتائج چیز بن سکتا ہے اور ندوہ کا حقیقی بدل بلکہ نعم البدل۔ اصلی کام وہی ہے باقی سب کے سب فروعی ہیں۔ آپ کی زندگی کا اصل مقصد یہ ہونا چاہئے کہ آدمی پیدا ہوں[۳۱]"

ایک دوسرے خط میں دارالمصنفین سے دلچسپی اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

" دارالمصنفین کے قواعد اعظم گڑھ سے آئے ہیں سوائے چند دفعات کے سب بہتر و انسب ہیں۔ اب آپ جلد از جلد رجسٹرڈ کرالیں اور عملی کام کی صورت نکالیں۔ ایک دو آدمی بھی ہوں تو کام شروع کر نا چاہیئے۔ یہ ایسا معاملہ تھا کہ اس کے متعلق بالمشافہ صحبتیں ضروری تھیں[۳۲]"

---

[۳۰] الہلال جلد ۵ نمبر ۲۰ ، ۸ر نومبر ۱۹۱۴ء

[۳۱] مکاتیب ابوالکلام: ادبستان لاہور (باراوّل) ص ۲۴

[۳۲] 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۶

ایک اور خط میں دار المصنفین کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

> دار المصنفین کا پراسپکٹس پہنچا۔ آپ مجھے اس سلسلے میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے۔ آنریری فیلو تو ایک عمدہ بات ہے اگر اس میں کوئی جگہ قلمی کی ہو جب بھی میں منظور کر لونگا بشرطیکہ کام ہو اور مجمع صحیح و خالص ہو۔[۴۳]"

پھر جب جولائی ۱۹۱۶ء میں دار المصنفین سے معارف جاری ہوا تو مولانا آزاد نے اسے بے حد پسند کیا اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

مولانا آزاد کی دار المصنفین کی یہ دلچسپی ساری زندگی قائم رہی۔ اس کی کامیابیوں سے وہ ہمیشہ خوش ہوتے تھے اور اس کے مسائل اور مشکلات سے مضطرب ہو جاتے تھے، آزادی کے بعد انھوں نے مخالف فضا میں بھی ایک اچھی رقم دار المصنفین کو حکومتِ ہند سے دلوائی تھی۔ جس کا تذکرہ آج بھی دار المصنفین کے ذکر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

الہلال کے مختلف مقاصد میں ایک اہم مقصد مسلمانوں میں قرآن کے صحیح مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور ان کے صحیح معنی و مفہوم تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ الہلال کے اجراء کے ساتھ ہی "قرآن کے مطالعہ و تدبر کی ایک راہ روشنی میں آئی"، میں مزید وضاحت کے ساتھ اس پہلو پر مولانا آزاد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

---

[۴۳] مکاتیب ابوالکلام: ادبستان لاہور (بار اوّل) ص ۲۸

پھر ۱۹۱۴ء کی کسی تاریخ کو مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ میں قرآن حکیم کے درس وتعلیم کے لیے "دارالارشاد"، کی بنیاد ڈالی اور ۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء کے الہلال میں یہ خبر شایع ہوئی:

"حزب اللہ کے مرکزی دارالجماعت کا سنگِ بنیاد گزشتہ اتوار (یکم رمضان ۱۳۳۲ھ) کو نصب کردیا گیا اور مولانا کے والد کے ایک مخلص قدیم دوست نے شہر کلکتہ کے قریب ایک قطعہ زمین وقف کردیا اور "دارالارشاد"، یعنی لکچر روم یا ایوانِ درس کی تعمیر کے تمام مصارف بھی انھوں نے اپنے ذمے لیے۔ اس جگہ ایک مسجد تیار ہے اور ہزار روپے ہیں۔ بورڈنگ کا ایک کمرہ بنے گا۔ امید کی گئی کہ اللہ ایسے لوگوں کو بھیج دے گا جو بورڈنگ بنوادیں گے۔ جو بعض کاغذات بطور آثار اساس ایک بوتل میں بند کرکے بنیاد میں رکھے گئے ان میں سورۂ الحج کی پانچ آیتیں وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ ..... الخ اور سورۂ یونس کی رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً .. ... الخ بھی رکھی گئی [۳۳]"

الہلال کی اشاعت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد اسلام کی صحیح خدمت تھا، جس کا اظہار الہلال کی پہلی جلد کے اختتام یعنی ۶ نومبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں اس طرح کیا گیا ہے:

"اسلام ہر مسلمان سے اپنے آخری حق کا طلب گار ہے۔

---

[۳۳] ترجمان القرآن جلد اوّل ساہتیہ اکادمی دہلی ص ۵۵/۵۵۱

مسلمانوں کی نمازیں اور روزے اور تمام مالی و بدنی عبادات
مقبول نہیں ہو سکتیں جب تک وہ حفظ کلمہ توحید و ثغور اسلامیہ
کے لیے جان و مال سے حصہ نہ لیں۔ پھر کوئی ہے جو آج خدا کو
اپنے نفس و مال پر ترجیح دے ۳۵؟"

اس کے بعد ۸ر جنوری ۱۹۱۳ء کے شماروں میں انھوں نے واضح الفاظ میں ایک بار پھر افتتاحیہ مقالہ میں الہلال کے مقاصد میں دین الٰہی کی دعوت کی تجدید کا اظہار کیا ہے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں غور و فکر کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت "حزب اللہ" بنائی جائے جو مولانا کی خواہش کے مطابق نہایت سچائی کے ساتھ دین کی خدمت انجام دے۔ اسی کے ساتھ نظم جماعت کی کوشش میں بھی مولانا ابوالکلام آزاد مصروف رہے۔ اس کوشش میں مولانا محمود الحسن دیوبندی نے نہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد کی حمایت کی بلکہ عملی تعاون بھی دیا۔ لیکن انھیں حجاز کے لیے روانہ ہونا پڑا جس کی وجہ سے "تحریک نظم جماعت" کو مولانا تنہا آگے نہیں بڑھا سکے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ مولانا آزاد تدریس قرآن، تحریک حزب اللہ اور تحریک نظم جماعت کے ساتھ تحریک ہجرت اور تحریک جہاد سے بھی متاثر تھے اور ان تحریکوں سے بھی عملی دلچسپی لے رہے تھے۔

اگست ۱۹۱۴ء میں جنگ چھڑی تو کلکتہ کے لوگوں کے زور دینے پر الہلال کا روزنامہ ضمیمہ بھی شائع ہونا شروع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

---

۳۵ شذرات الہلال جلد ا نمبر ۱۶/ ۱۷، ۶ر نومبر ۱۹۱۲ء

اس دوران میں الہلال میں زیادہ تر جنگ سے متعلق خبریں، معلومات، مضامین وغیرہ شایع ہوتے رہے۔ مولانا کی تحریریں بھی زیادہ تر جنگ سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ جن میں وہ نہایت بے باکی کے ساتھ سچائی کا اظہار کرتے رہتے تھے اور غیر ملکی حکومت کی بداعمالیوں اور بدعنوانیوں کی نشان دہی کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے حکومت "الہلال" کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے موقع تلاش کرتی رہی، چنانچہ موقع ہاتھ آہی گیا۔ "الہلال" کے دو شمارے ۱۴ اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء ایک ساتھ منظر عام پر آئے۔ جس میں "حدیث الجنود" اور "سقوط انٹروپ" ایسے مضامین شایع ہوئے جو حکومتِ بنگال کے نزدیک قابل اعتراض تھے۔ اخبار پائینر نے جو حکومت برطانیہ کا نہایت خیر خواہ تھا۔ مولانا آزاد کے خلاف نہایت زہریلا مضمون شایع کیا اور حکومت کو ان کے خلاف سخت کارروائی کے لیے اکسایا۔ چنانچہ حکومت نے ان شماروں کو ضبط کر لیا اور دو ہزار کی وہ رقم بھی جو ستمبر ۱۹۱۳ء میں ضمانت کے طور پر طلب کی گئی تھی نومبر ۱۹۱۴ء میں ضبط کر لی گئی۔

اس وقت مولانا آزاد سفر میں تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں ضبطی اور خانہ تلاشی کا وارنٹ آیا تھا جس کی اطلاع جب مولانا آزاد کو دی گئی تو انھوں نے تار سے جواب بھیجا کہ جو نمبر[۳۵] شایع ہونے جارہا ہے اس میں ضبطی کی اطلاع دے کر یہ اعلان کر دیا جائے:

---

۳۵ ۸ نومبر ۱۹۱۴ء

"ہم اپنی ذات سے آخر وقت تک "الہلال" کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور انشاء اللہ العزیز رکھیں گے۔ اس لیے ہم حسب ہدایت اس پرچہ کو شایع کر دیتے ہیں اور "الہلال" کی آئندہ زندگی کی قارئین کرام کو کامل توقع دلاتے ہیں۔"

۱۹۱۴ء کا سال مولانا آزاد کے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ انھوں نے اسی سال پہلی مرتبہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا غیر مطبوعہ کلام الہلال کے ذریعہ دنیائے ادب اور شیدایانِ غالب کے سامنے پیش کیا۔ اس سے قبل انھوں نے غالب کے اشعار اپنی تحریر و تقریر میں استعمال کر کے غالب سے گہرے تعلق کا ثبوت ضرور پیش کیا تھا لیکن غالب کا غیر مطبوعہ کلام اور اس سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر کے انھوں نے اپنی غالب شناسی کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ غالب پر نئی تحقیق و تنقید کے لیے راستہ کھول دیا[۳۵] لیکن یہ سلسلہ الہلال کے بند ہو جانے کی وجہ سے بند ہو گیا۔

الہلال بند ہو گیا تو مولانا آزاد خاموش نہیں بیٹھے، انھوں نے ترجمان القرآن کا کام شروع کر دیا۔ جس کی خواہش انھیں مدت سے تھی، چنانچہ الہلال کی اشاعت کے زمانہ میں قرآن فہمی اور روزانہ کی عملی زندگی میں اس کی اہمیت سے برابر آگاہ کرتے رہتے تھے۔ موقع ملا تو

---

۳۵ دیکھئے الہلال ۱۷ جون ۱۹۱۴ء یکم جولائی ۱۹۱۴ء، ۲۲ جولائی ۱۹۱۴ء

اس کام کی طرف پوری توجہ دی اور اس دوران میں ترجمان القرآن اور تفسیر کے کام کا بڑا حصّہ پورا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اہم کام شاہ ولی اللہ کی سوانح بھی مکمل کر لی۔ یہ کام بھی بہت دنوں سے ادھورا پڑا ہوا تھا۔ تقریبًا ایک سال تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن چونکہ دل میں طے کر لیا تھا کہ الہلال کی جگہ دوسرا ہفتہ وار جاری کریں گے اور اس کے لیے وہ برابر کوشش کرتے رہے تھے خاموشی اختیار نہیں کر لی تھی اس لیے ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو "البلاغ" کا شمارہ کلکتہ سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ پرچہ ۳۱ر مارچ ۱۹۱۶ء تک کل پانچ مہینے بڑی بےترتیبی کے ساتھ جاری رہ سکا۔ اس لیے کہ مولانا آزاد اس زمانہ میں پریشانیوں میں مبتلا رہے تھے حکومت ان پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھی جس کی وجہ سے مولانا کی خواہش تھی کہ کوئی معتبر آدمی "البلاغ" کو چلائے تاکہ اگر وہ کسی پریشانی میں گرفتار ہوں تو "البلاغ" جاری رہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک بار پھر مولانا سید سلیمان ندوی کو "البلاغ" میں کام کرنے کی دعوت دی۔ مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ وہ "دارالارشاد" کا کام بھی سنبھالیں لیکن مولانا سید سلیمان ندوی ادارہ البلاغ سے وابستہ نہیں ہوسکے۔

آخر وہ وقت آگیا جس کا خطرہ محسوس کیا جارہا تھا۔ حکومت بنگال نے اس الزام میں کہ مولانا ملک معظم کے دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں' ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳ کی بنا پر ۲۳ر مارچ کو حکم دیا کہ ایک ہفتہ کے اندر صوبہ بنگال سے باہر چلے جائیں۔ دوسری صوبائی حکومتیں پہلے ہی سے ان کا داخلہ اپنے صوبوں میں بند کر چکی تھیں۔ صرف صوبہ بہار میں یہ پابندی نہیں لگائی گئی تھی اس لیے مولانا آزاد نے رانچی جانے کا

فیصلہ کیا اور ۳۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو تنہا روانہ ہوگئے اور رانچی پہنچ کر وہاں سے قریب ایک گاؤں مورابادی میں اپنے قیام کا انتظام کیا۔ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومت نے رانچی میں نظر بندی کے احکام جاری کیے اور حکومتِ بہار کے حکام اور پولیس افسروں نے تلاشی لی اور تمام کتابیں اپنے ساتھ لے گئے۔

مولانا فضل الدین بہت دنوں سے خواہشمند تھے کہ مولانا کی زندگی کے حالات قلمبند ہوجائیں جس کا اظہار انھوں نے مولانا آزاد سے پہلے بھی بار بار کیا تھا اب جبکہ مولانا رانچی میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے مولانا فضل الدین ان سے ملنے رانچی آئے اور چند روز مولانا کے ساتھ قیام کیا۔ اسی دوران میں ایک دن موقع پاکر اپنی پرانی خواہش کا ایک بار پھر اظہار کیا اور حالات زندگی لکھنے کا وعدہ مولانا آزاد سے لے لیا۔ مولانا آزاد نے حسبِ وعدہ لکھنا بھی شروع کر دیا اور قسط وار مولانا فضل الدین کو بھیجنے بھی لگے۔ لیکن اپنے حالات کے بجائے خاندانی حالات قلمبند ہونے لگے۔ ٹوکنے پر مولانا نے رکاوٹ پیدا کرنے سے منع کیا۔ ۱۷ اکتوبر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر مولانا فضل الدین فروری ۱۹۱۷ء کو دوبارہ رانچی پہنچے۔ اس بار چھ ماہ تک مستقل قیام کیا اور مولانا کی زندگی کے حالات پندرہ سوالات کرکے خود لکھتے گئے۔ تقریباً دو سال بعد ستمبر ۱۹۱۹ء میں پہلی بار "تذکرہ" کے نام سے البلاغ پریس کلکتہ سے یہ کتاب مولوی فضل الدین کے زیر اہتمام شایع ہوئی لیکن اس میں مولانا کی زندگی کے وہ حالات جو مولانا فضل الدین نے لکھے تھے شامل نہیں کیے گئے۔

رانچی کے اسی زمانہ نظر بندی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اس شہر میں "انجمن اسلامیہ" کی بنیاد ڈالی؛ تاکہ مسلمانوں کی اصلاح، تعلیمی فروغ،

اجتماعی نظام کی درستی اور دینی خدمت کی جائے۔ اسی انجمن کے تحت ایک مدرسہ کی بھی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ جس کا سالانہ جلسہ نہایت اہتمام سے ہوا کرتا تھا، جس میں مولانا آزاد کی وجہ سے علماء بھی شرکت کرتے تھے۔

۱۹۱۹ء آتے آتے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا اس قدر زور تھا کہ کلکتہ اور دہلی کے مسلمانوں نے غیر مسلموں کو بھی جلسوں میں شریک ہونے کے لیے مسجدوں میں آنے کی اجازت دے دی تھی۔ دہلی کے مسلمانوں نے سوامی شردھانند سے جامع مسجد میں تقریر کرائی۔ جس کے خلاف بعض اخبارات نے انگریزوں کے اشارے پر آواز اٹھائی اس لیے کہ انھیں یہ اتحاد پسند نہ تھا۔ مولانا آزاد نے اس اعتراض کے جواب میں ایک رسالہ " جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد" قلمبند کیا۔ جس میں غیر مسلموں کے مسجدوں میں داخلے کو جائز ثابت کیا۔ یہ مقالہ پہلے مئی، جون ۱۹۱۹ء کے معارف میں شایع ہوا۔ بعد میں کتابی شکل میں بھی منظر عام پر آیا۔

مدّت سے مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال تھا کہ وقت کی ضروریات کے مطابق قرآن کا ترجمہ ہو اور تفسیر لکھی جائے۔ بدقسمتی سے کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کی اس خواہش پر پوری اترتی اور قرآن کے مطالعہ اور اس کی روح یک پہنچنے میں رہنمائی کے فرائض انجام دے سکتی۔ رانچی میں مولانا نے جب انجمن اسلامیہ اور اس کے مدرسہ کی بنیاد ڈالی تو اس ضرورت کو اور زیادہ شدّت کے ساتھ محسوس کرنے لگے چنانچہ اس نظر بندی کے زمانے میں انھوں نے ترجمہ وتفسیر کا کام جاری رکھا لیکن ابھی آٹھ پارے کا ہی ترجمہ کر پائے تھے کہ مولانا کے مکان کی Sir Charles Cleve Land نے

دوبارہ تلاشی لی اور دوسرے کاغذات کے ساتھ آٹھ پارہ کی تفسیر و ترجمہ کے مسودات بھی ساتھ لے گئے۔ اس کے باوجود مولانا نے ہمت نہیں ہاری اور نویں پارہ سے ترجمہ کا کام جاری رکھا اور ۱۹۱۸ء کے آخر تک اس کام کو پورا کر دیا۔ اس درمیان میں یہ کوشش بھی کرتے رہے کہ آٹھ پاروں کا ترجمہ شدہ مسودہ واپس مل جائے لیکن جب ناکام ہوئے تو پھر دوبارہ ان پاروں کا ترجمہ کیا اور ٹائپ کرانا بھی شروع کر دیا لیکن ابھی نصف مسودہ ہی ٹائپ ہو سکا تھا کہ ۲۷ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو مولانا رہا کر دئے گئے۔ رہائی کے وقت مولانا آزاد کی زبان پر یہ شعر تھا:

قصد کرتا ہوں جو اس جا سے کہیں جانے کا
دل یہ کہتا ہے کہ 'تو جا' میں نہیں جانے کا

تقریبًا چار سال کے بعد مولانا آزاد کی رہائی ہوئی۔ قید و بند کی زندگی سے نجات پائی تو دیکھا کہ سارے ہندوستان میں عجیب سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ جنگ عظیم کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ہندوستان کو اپنی قربانیوں اور وفاداریوں کے صلے میں "رولٹ بل" سیاہ قانون کی صورت میں ملا تھا، جس کے خلاف پورے ملک میں نفرت کی لہر پھیل گئی تھی چنانچہ ۶ر اپریل ۱۹۱۹ء کو اس بل کے خلاف سارے ہندوستان میں مظاہرہ کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں خاص طور سے صوبہ پنجاب پر ظلم ڈھایا گیا اور زیادتیاں کی گئیں۔ اگرچہ احتجاجی جلسے پُر امن ہوئے لیکن جنرل ڈائر کے حکم سے پنجاب کے مختلف مقامات پر گولیاں چلیں۔ ان میں جلیان والا باغ کا واقعہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے ۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء یکم بیساکھی کے دن امرتسر کے لوگ اپنے رہنماؤں کی گرفتاری کے

خلاف احتجاج کرنے جلیان والا باغ میں جمع ہوئے تھے جہاں ظالم جنرل ڈائر کے حکم سے وہ گولیوں کا نشانہ بنائے گئے جس کے نتیجے میں تقریبًا پانچ سو بے گناہ انسان شہید ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

مولانا آزاد نے رانچی سے نکلنے کے بعد ان حالات کا جائزہ لیا، انھوں نے ہندوستانیوں کے ردِ عمل کو محسوس کیا اور ان کے اضطراب سے بہت متاثر ہوئے۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات ہوئی اس سے پہلے گاندھی جی نے رانچی کی نظربندی کے زمانے میں مولانا آزاد سے وہاں ملنے کی کوشش کی تھی لیکن حکومت بہار نے اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ اب جو گاندھی جی سے ملاقات ہوئی تو اس وقت اس تجویز پر غور کیا جارہا تھا کہ خلافت اور ترکی سے متعلق ہندوستانی مسلمان کے جو کچھ احساسات اور جذبات ہیں ان سے وائسرائے کو آگاہ کرایا جائے اور اس غرض سے ایک وفد بھیجا جائے۔ گاندھی جی نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور اعلان کیا کہ" وہ اس معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے کو تیار ہیں۳۸"

۲۰ر جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں جلسہ ہوا، جس میں گاندھی جی، لوک مانیہ تلک کے علاوہ دوسرے کانگریس رہنما بھی شریک ہوئے تھے ان حضرات نے بھی خلافت کے مسئلہ میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی تائید کی وفد وائسرائے سے ملنے کے لیے گیا۔ مولانا نے عرضداشت پر دستخط تو کردیا تھا لیکن وفد میں شامل نہیں ہوئے تھے اس لیے کہ

۳۸ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۲۳

ان کی رائے تھی:

"اب معاملہ عرضداشتوں اور وفدوں کی منزل سے بہت آگے بڑھ گیا ہے[۳۸]"

لیکن وائسرائے نے کوئی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ وفد اگر برطانیہ جانا چاہے تو وہ اس کے لیے آسانیاں پیدا کر دیں گے۔

وفد کی وائسرائے سے ملاقات اور مقصد میں ناکامی کے بعد ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں سوال یہ درپیش تھا اگلا قدم کیا اٹھایا جائے، اس جلسے میں حکیم اجمل خاں، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی موجود تھے۔ گاندھی جی نے اپنا عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اب عرضداشتوں اور وفود کے ملنے کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اس لیے حکومت کی تائید سے پرہیز کرنی چاہئے انھوں نے تجویز پیش کی کہ خطابات واپس کر دئے جائیں اور عدالتوں اور مدرسوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ملازمتیں چھوڑ دی جائیں اور بننے والی نئی قانون ساز جماعت میں حصّہ نہ لیا جائے۔ مولانا آزاد بیان کرتے ہیں:

"جیسے ہی گاندھی جی نے اپنی تجویز بیان کی مجھے یاد آیا کہ یہ وہی پروگرام ہے جس کا خاکہ ٹالسٹائی نے بہت سال پہلے پیش کیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں ایک انارکسٹ نے اٹلی کے بادشاہ پر حملہ کیا تھا، اس وقت ٹالسٹائی نے

---

[۳۸] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۲۴

انارکسٹ جماعت کے نام ایک کھلا خط شایع کیا۔ جس میں لکھا تھا کہ تشدد کا طریقہ اخلاقی اعتبار سے غلط اور سیاسی نقطہ نظر سے بے سود ہے۔ اگر ایک شخص قتل کیا گیا تو ہمیشہ کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے کے لیے مل جائیگا۔ درحقیقت تشدد کا نتیجہ ہمیشہ زیادہ سخت تشدد پیدا کرتا ہے [۴۵]،،

مولانا آزاد نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ انھوں نے الہلال کے بعض مضامین میں اس طرح کے پروگرام پیش کیے تھے۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی تجاویز پر غور کرنے کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں گاندھی جی نے اس بات پر زور دیا کہ سوراج حاصل کرنے اور خلافت کے مسئلہ کے حل کرنے کے لیے عدم تعاون کی تجویز بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جلسہ کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی۔ سی۔ آر۔ داس بھی شریک ہوئے تھے۔ یہ دونوں گاندھی جی سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ بپن چندر پال نے کہا کہ برطانوی حکومت سے لڑنے کے لیے سب سے اچھا ہتھیار برطانوی مال کا بائیکاٹ ہے لیکن ان لوگوں کی مخالفت کے باوجود عدم تعاون کی تحریک کا ریزولیوشن بڑی اکثریت سے منظور ہوا۔

اس کے بعد مولانا آزاد، گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں نے سارے ملک کا سفر کیا، تاکہ عدم تعاون کا پروگرام لوگوں تک پہنچایا جائے اس سفر میں مولانا آزاد زیادہ تر گاندھی جی کے ساتھ رہے۔ مولانا محمد علی

---

[۴۵] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۲۵

اور مولانا شوکت علی بھی اکثر ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

تحریک ترک موالات کے زمانے ہی میں یعنی اواخر ۱۹۲۰ء میں مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد کلکتہ کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ لیکن اس کا باقاعدہ افتتاح ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی کے ہاتھوں کرایا گیا۔ اس موقع پر بہت سے ہندو اور مسلمان جمع تھے۔ اس تقریب میں گاندھی جی نے ایک تقریر کی تھی اور معائنہ رجسٹر پر اپنے ہاتھوں سے تحریر کیا تھا:

" میں مدرسہ کی ترقی کے لیے دُعا (دعا) کرتا ہوں [۱۴۱]"

تحریک ترک موالات کے زمانے میں ایسے مدرسوں کی بنیادیں اس لیے ڈالی جارہی تھیں تاکہ انگریز حکومت کے اثرورسوخ سے یہ مدرسے آزاد ہیں۔ مولانا آزاد تعلیمی نصاب میں بھی مسلمانوں کی خواہش کے مطابق اصلاح کرنا چاہتے تھے انھیں اس بات کا یقین تھا کہ اس طرح سارے ہندوستان میں اس کا اچھا اثر پڑے گا۔ دو سال تک یہ مدرسہ نہایت کامیابی کے ساتھ چلا۔ اس کے اساتذہ میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا حسین احمد مدنی بھی تھے [۱۴۲]

مارچ ۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد نے گاندھی جی کے ساتھ تیسری بار پنجاب کا دورہ کیا، اس وقت لاہور اور امرتسر کے اضلاع میں پبلک جلسوں پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔ مولانا آزاد نے یہ گنجائش نکالی کہ انھیں ذاتی طور پر خلاف ورزی کرنے کا اختیار ہے۔ گاندھی جی نے

---

[۱۴۱] مکاتیب ابوالکلام آزاد: ابوسلمان شاہجہانپوری (مرتب) ص ۱۱۱
[۱۴۲] تحریک نظم جماعت: ابوسلمان شاہجہانپوری ص ۱۸۱-۱۸۲

بھی مولانا آزاد کے اس طرزِ عمل کو جائز قرار دیا۔ چنانچہ جمعہ کے دن خطبہ کے بعد مولانا آزاد نے شاہی مسجد میں دل ہلانے والی تقریر کی جس کے بارے میں "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے لکھا کہ اس تقریر کے ذریعہ مولانا آزاد نے پنجاب میں علانیہ خلاف ورزی کی اور اگر ان کے خلاف حکومت نے کارروائی نہیں کی تو شورش پسندوں کی ہمت افزائی ہوگی۔ اس اداریہ کی سرخی تھی:

"صحن مسجد میں باغیانہ لکچر"

پھر ایک ہفتہ بعد مولانا آزاد امرتسر تشریف لے گئے جہاں انھوں نے ایسی ہی باغیانہ تقریر کی۔

۲۵، ۲۶ رجون ۱۹۲۱ء کو جمعیۃ العلماء بہار کا اجلاس ہوا جس کی صدارت مولانا آزاد نے فرمائی جس میں صوبہ بہار و اڑیسہ کے تقریباً تین سو علماء نے شرکت کی تھی۔ اس اجلاس میں پہلی بار صوبہ بہار میں امارت شرعیہ کا نظم قائم کیا گیا۔ جس کا ذکر مولانا آزاد نے اپنی تقریر جمعیۃ علمائے ہند کے لاہور کے جلسہ نومبر ۱۹۲۱ء میں اس طرح کیا ہے:

> "گزشتہ موسم گرما میں جب اس طرف سے مایوسی ہوگئی کہ تمام ملک کے لیے متفقہ و متحدہ نظم قائم ہو تو پھر یہ ارادہ کیا کہ اقلاً صوبہ وار تنظیم کا کام شروع کر دیا جائے۔ چونکہ صوبہ بہار میں تین چار سال سے ابتدائی بنیادی کام کر رہی تھی اس لیے سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کی گئی اور میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں حضرات علمائے بہار کو مبارکباد دوں کہ انھوں نے سبقت بالخیرات کا مقام علی

حاصل کیا اور جمعیت علمائے بہار کے جلسہ میں تین سو کے مجمع علمار نے بالاتفاق اپنا امیر شریعت منتخب کر لیا۔"[۴۳]

۲۵ اگست ۱۹۲۱ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے جو خطبہ صدارت مجلس خلافت آگرہ میں پڑھا وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس سے اُن کی قرآن اور مذہب کے ساتھ وابستگی، ان کے سیاسی شعور، انگریزوں کے خلاف ان کے جذبات، ہندو مسلم اتحاد اور آزادیِ ہند کے لیے ان کے دل میں بے پناہ جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا آزاد رانچی سے آنے کے بعد سے کسی ہفتہ وار کے جاری کرنے کے لیے فکرمند تھے لیکن حالات سازگار نہیں ہو رہے تھے۔ اس فکر میں ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا۔ آخر ۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کلکتہ سے ہفتہ وار "پیغام" کا اجرا، زیر ادارت عبدالرزاق ملیح آبادی عمل میں آیا۔ جس نے اگرچہ چند ماہ کی زندگی پائی لیکن مولانا کے اس زمانے کے خیالات کو وسیع تر حلقے میں پہنچانے میں بڑی مدد کی۔

۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء کا بمبئی میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی کا جلسہ اس لیے اہم ہے کہ اس کی ورکنگ کمیٹی نے حسب ذیل تجویز پاس کی:

> "ورکنگ کمیٹی کی رائے ہے کہ جس روز شہزادہ ویلز بمبئی کے ساحل پر قدم رکھیں۔ تمام ہندوستان میں ہڑتال کی جائے۔ پھر جس جس شہر میں وہ جائیں وہاں

---

[۴۳] خطبات آزاد: مالک رام: ساہتیہ اکادمی ص ۱۳۷

کے سرکاری استقبال کو موثر بائیکاٹ کرنے کے انتظامات
صوبہ کی کانگریس کمیٹیاں کرلیں۔"

۱۱/نومبر ۱۹۲۱ء کے پیغام کے شذرات میں مولانا آزاد نے "سول ڈس اور بیڈینس" کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے تحریر کیا:

"سول ڈس اوبیڈینس" ہندوستان کی متحدہ قائم مقام سیاسی جماعت آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی نے ۴/نومبر (۱۹۲۱ء) میں دہلی میں سول ڈس اوبیڈینس کو باتفاق آرا پاس کر دیا ہے اور اس طرح اپنی زندگی، سرگرمی اور قیادت کی کامل صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ کانگریس کمیٹی نے درحقیقت وہ کیا ہے جس کی اس طرح شدید ضرورت تھی اور جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔[۲۴۴]"

۱۷/نومبر ۱۹۲۱ء کو پرنس آف ویلز کی آمد کا دن تھا — کانگریس نے اس دن عام ہڑتال کا اعلان کیا تھا۔ مولانا آزاد نے اس دن کو تاریخ ہند کا یادگار دن قرار دیا، انھوں نے اپنے خیالات کا اس طرح اعلان کیا:

"اس دن کے بارہ گھنٹوں کے اندر ہم برسوں اور قرنوں کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ سچی خدا پرستی، ودینداری، بے لوث حب الوطنی، وخودداری، کامل اتفاق و اتحاد غیر مسخر قومی وملکی طاقت، اسلام اور ہندوستان کے لیے

۲۴۴؎ شذرات: پیغام کلکتہ جلد ۱ شمارہ ۸ ۱۱/نومبر ۱۹۲۱ء

فتحمندانہ عزم یعنی قومی زندگی کی تمام برکتیں، ہم اس دن
پالیں گے بشرطیکہ اتنا قابو اپنے اوپر پالیں کہ اپنا تمام
کاروبار، لین دین، ملنا جلنا، آمدورفت قطعاً بند کردیں،
کامل امن وسکون، خاموشی وقار کے ساتھ اپنے اپنے
گھروں میں بیٹھے رہیں اور اس طرح پرنس آف ویلز کے
ورود کا یادگار مقاطعہ انجام پائے۔"

امن اور سکون

ہمارے تمام کاموں کی کامیابی کے لیے پہلی شرط

صرف ہڑتال ہو

کوئی جلوس نہ نکلنے، سڑکوں اور بازاروں میں ہجوم نہ کیا
جائے، امن اور سکون کے خلاف کوئی حرکت نہ ہو، صرف
کامل ہڑتال ہونی چاہیئے اور ایک دن کے لیے شہروں،
آبادیوں اور بستیوں کو سنسان بنا دینا چاہیئے، البتہ اگر
ذمہ دار خلافت اور کانگریس کی جماعتیں چاہیں تو شام
کو کامل انتظام کے ساتھ ایک جلسہ کرکے بائیکاٹ کی تکمیل
کا اعلان دے سکتے ہیں۔"

ابوالکلام[۴۵]

---

[۴۵] پیغام کلکتہ جلد ۱ نمبر ۸ ۱۱ نومبر ۱۹۲۱ء

اخبار میں مندرجہ بالا بیان دینے کے بعد مولانا آزاد ۱۶ر نومبر ۱۹۲۱ء کو جمعیۃ العلمار ہند کے اجلاس کی صدارت کے لیے کلکتہ سے لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔ ۱۸ر نومبر کو وہ لاہور پہنچے، جہاں ۱۹ر نومبر کو گاندھی جی اور پھر ایسوسی ایٹڈ پریس کے تار ملے، جن سے بمبئی کے ہنگاموں کی اطلاع ملی، چنانچہ مولانا آزاد ۲۲ر نومبر کو ہی بمبئی واپس لوٹ گئے۔ جہاں آٹھ دن قیام کے بعد یکم دسمبر ۱۹۲۱ء کو کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔ کلکتہ کے اسٹیشن پر جب گاڑی رکی اور مولانا گاڑی سے اترے تو اطلاع ملی کہ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی گرفتار کر لیے گئے۔ بعد میں ۱۴ر دسمبر کو مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کو دو سال کی سزا ملی۔ ان حالات میں مولانا آزاد بدایوں کے جلسۂ جمعیت العلمار میں شریک نہیں ہو سکے حالانکہ حکومت چاہتی تھی کہ مولانا بدایوں چلے جائیں تاکہ گرفتار ہونے سے بچ جائیں۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"آج آٹھ دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح ہے۔ کل شام کو مجھے قابل وثوق ذرائع سے اطلاع مل گئی کہ گورنمنٹ بنگال نے وائسرائے کے مشورے کے بعد میری اور مسٹر سی۔ آر۔ داس کی گرفتاری کا فیصلہ دیا گیا ہے۔ میری نسبت گورنمنٹ بنگال کا ارادہ یہ ہے کہ اگر گیارہ دسمبر تک کلکتہ سے باہر نہ گیا تو مجھے گرفتار کرے گی۔ لیکن اگر میں بدایوں کے جلسہ جمعیت علمار میں چلا گیا تو پھر اس کے سر سے بلا ٹل جائے گی اور مسٹر سی۔ آر۔ داس گرفتار کر لیے جائیں گے[۲۴۶]"

۲۴۶ پیغام کلکتہ جلد ۱ نمبر ۱۳، ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء ص ۴

۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا آزاد کی گرفتاری اس طرح عمل میں آئی کہ مسٹر گولڈی ڈپوٹی کمشنر اسپیشل برانچ اپنے ساتھ ایک یورپین انسپکٹر آف پولس لے کر آئے اور مولانا آزاد کے بارے میں دریافت کیا، اُس وقت مولانا آزاد اوپر کی منزل میں مولوی فضل الدین کو خطوط کے جوابات لکھوا رہے تھے۔ مولانا نے دریافت کیا کہ وارنٹ لائے ہیں؟ جس کا جواب انھوں نے نفی میں دیا، پھر بھی مولانا آزاد جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ مولانا پانچ چھ منٹ کے لیے اندر گئے اور پھر واپس آئے تو ساتھ چلنے کو تیار تھے۔ گولڈی کو شاید حیرت ہوئی اس نے کہا کہ اگر آرام کے لیے کوئی چیز ساتھ لینا چاہیں تو لے لیں۔ مولانا نے صرف ایک گرم چادر اپنے ساتھ رکھی اور روانگی کے وقت صرف اس قدر کہا:

> "کلکتہ اور باہر کے تمام احباب اور قومی کارکنوں کو میرا پیام پہنچا دیا جائے کہ تمام لوگ اپنے اپنے کاموں میں مستعدی کے ساتھ مشغول رہیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے کوئی شخص نہ آئے نہ اپنی جگہ اور اپنے کام چھوڑے، گرفتاریوں کو ایک معمولی اور متوقع واقعہ کی طرح محسوس کرنا چاہیئے کسی طرح کی خلاف معمول اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ مجھے بڑا ہی رنج ہوگا اگر کسی کارکن نے میری ملاقات کے لیے اپنا ایک گھنٹہ بھی ضایع کیا۔" [۴۷]

مولانا آزاد ۱۰ر دسمبر کو گرفتار ہوئے ۱۳ر دسمبر سے پیشی شروع

---

[۴۷] قول فیصل، مولانا آزاد: چمن بکڈپو دہلی ص ۴۲

ہوئی۔ آخری پیشی ۹ فروری ۱۹۲۲ء کو ہوئی اور مولانا کو ایک سال قید بامشقت کی سزا دی گئی، اس مقدمہ میں مولانا نے نہایت بے باکی کے ساتھ پرجوش تاریخی بیان دیا تھا جس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی گاندھی جی نے اس بیان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا:

> "مولانا ابوالکلام آزاد نے جو بیان عدالت میں دیا ہے اس کی نقل ابھی میرے پاس پہنچی ہے یہ فل اسکیپ سائز کے ۳۳ صفحوں پر ٹائپ کیا ہوا ہے لیکن اس قدر طویل ہونے پر بھی سب کا سب پڑھنے کے قابل ہے۔ اصل بیان مولانا کی فصیح و بلیغ اُردو میں ہوگا۔ یہ اس کا انگریزی ترجمہ ہے۔ ترجمہ برا نہیں ہے۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں اس سے بہتر ممکن تھا۔
>
> مولانا کے بیان میں بہت بڑی ادبی خوبصورتی ہے وہ نہایت وسیع روانی کے ساتھ نہایت پُرجوش بھی ہے وہ نہایت دلیرانہ ہے۔ اس کا لہجہ غیر متزلزل اور غیر آشتی طلب (اَن کمپرومائزنگ) مگر ساتھ ہی سنجیدہ و متین بھی ہے تمام بیان میں اوّل سے آخر تک ایک پُرجوش اثر پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خلافت اور نیشنلزم پر مولانا ایک پر اثر خطبہ دے رہے ہیں[۴۵]"

---

[۴۵] قول فیصل: مولانا آزاد: چمن بکڈپو دہلی ص ۳۰- ۳۱

۷ جنوری ۱۹۲۳ء کو مولانا ابوالکلام آزاد تقریباً ایک سال بعد رہا ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں :

"یہی وجہ ہے کہ ۷ جنوری ۱۹۲۳ء کو میں جب قید خانے سے نکلا تو اس بار میں ایک طے شدہ ارادہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ خیال تھا کہ جونہی وقت کی سیاسی مشغولیت مہلت دیگی پہلا کام یہ کروں گا کہ چار پانچ سال کے لیے کسی ایسے گوشے میں کہ صحت کی درماندگیوں کے لیے سود مند اور چند رفقائے علم وعمل کی موجودگی سے دلپسند ہو گا مقیم ہو جاؤنگا اور اپنے پیش نظر علمی وعملی مقاصد کی مشغولیت وتکمیل کے سوا اور کسی کام سے علاقہ نہیں رکھوں گا۔"

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے !

....

تو قید خانے کی کوٹھری میں موقع ملا کہ مستقبل کی طرف نظر اٹھاؤں اور وقت کی ضرورتیں اور اپنی استعداد کار دیکھتے ہوئے آئندہ کاموں کا فیصلہ کروں۔ میں نے فیصلہ کیا اور اس پر مطمئن دل ودماغ لے کر ۷ جنوری ۱۹۲۳ء کو باہر نکلا۔ لیکن باہر نکلنے کے بعد ملک کی جو صورت حال سامنے آئی وہ بھی ایسی نہ تھی کہ نظر انداز کر دی جاتی۔ تحریک کی عملی قوتیں ختم ہو چکی تھیں تفرقہ و انتشار ہر گوشہ میں نمایاں تھا۔ کانگریس دو محارب جماعتوں میں بٹ گئی تھی، اور ایک دوسرے کے خلاف

صف آرائی شروع ہوگئی تھی ضروری تھا کہ بقدر استطاعت
اصلاحِ حال کی کوشش کی جاتی لیکن جب کوشش شروع
کی تو بہ تدریج اس کا دامن پھیلتا گیا یہاں تک ۱۹۲۳ء
اسی میں نکل گیا،، [۴۹]

مولانا آزاد کی رہائی سے چھ ماہ پہلے سی۔آر۔ داس رہا کر دئے گئے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ۱۹۲۲ء میں گیا میں کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ چنانچہ مجلس استقبالیہ نے سی۔آر۔ داس کو صدر منتخب کیا۔ انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں تجویز پیش کی کہ کانگریس کاؤنسل میں داخل ہونے کے پروگرام کو منظور کرلے اور سیاسی جنگ مجلس قانون ساز کے اندر کرے[۵۰] کانگریس کی ایک جماعت نے راج گوپال اچاریہ کی رہنمائی میں اس تجویز کی مخالفت کی اس لیے کہ انھیں اندیشہ ہوا کہ اگر اس تجویز کو مان لیا گیا تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ گاندھی جی کی قیادت کمزور ہوگئی ہے۔

مسٹر سی۔آر داس، موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں نے مل کر سوراج پارٹی اور کاونسلوں میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ جس کی مخالفت گاندھی جی کے ان پیروؤں نے کی جو نہایت سختی کے ساتھ گاندھی کے ہمنوا تھے نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس دو جماعتوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک جماعت مسٹر سی۔آر۔ داس، موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں کی تھی، جو تبدیلی چاہتی تھی

---

[۴۹] الہلال دور ثانی جلد ا نمبر ا ۱۰ رجون ۱۹۲۷ء افتتاحیہ
[۵۰] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۴۲

(Prochanger) کہلائی۔ دوسری جماعت راجہ جی، سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی قیادت پر مشتمل تھی یہ Nochanger کہلائی یہ تبدیلی نہیں چاہتے تھے۔ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خلاف تھے اور اصل جنگ جو انگریزوں کے خلاف تھی ماند پڑ گئی تھی۔

دونوں جماعتوں نے کوشش کی کہ مولانا آزاد ان کے ساتھ ہو جائیں لیکن مولانا آزاد نے اپنے آپ کو دونوں جماعتوں سے الگ رکھا اور دوسروں کی کوشش کے باوجود کسی جماعت میں شامل نہیں ہوئے بلکہ دونوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کرتے رہے۔ آخر دونوں گروہ کے اتفاق رائے سے مولانا آزاد کی صدارت میں اگست ۱۹۲۳ء کو بمبئی میں کانگریس کا ایک خاص جلسہ ہونا قرار پایا۔ پھر دہلی میں ستمبر ۱۹۲۳ء[۱۵۱] کو بھی جلسہ مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا۔ اس وقت مولانا آزاد کی عمر صرف پینتیس سال کی تھی۔ اس کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت تک کانگریس کے جتنے صدر ہوئے تھے کوئی اس قدر کم عمر نہیں تھا۔ مولانا نے اپنے صدارتی خطبہ میں اس وقت کے مسائل، ترکی کی فتح عظیم، جدید مشرق، جزیرۃ العرب، قسطنطنیہ، داخیل، قوانین اجتماع کی وحدت، قومی جدوجہد کا سفر اور اس کی منزلیں، (Nonviolent) ترک موالات، ہندوستان کی میثاق ملی وغیرہ پہلوؤں پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی اور حاضرین کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب ہوئے انھوں نے کہا:

---

[۱۵۱] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۴۲

"تین سال ہوئے جب آپ ایک ایسے ہی خاص اجلاس میں بہ مقام کلکتہ جمع ہوئے تھے تو وہ بھی آپ کی تاریخ کا ایک عظیم الشان دن تھا، لیکن اس دن کی عظمت قوموں کے ان دنوں کی مانند تھی جن میں آزادی کی جنگ کا اعلان کیا گیا ہے اور آج کے دن کی اہمیت میں تاریخ کے ان ایام کی جھلک پائی جاتی ہے جن میں قوموں کو جنگ کی فیصلہ کن دشواریوں میں سے گزرنا پڑا ہے۔ اس دن آپ جنگ کے آغاز کے لیے فکر مند تھے، آج اس کے انجام کے لیے مضطرب ہیں۔ اس وقت آپ کو سفر کی جستجو تھی مگر آج گمرہی کا خطرہ پیش آگیا ہے [۵۲]"

آگے یہ بھی فرمایا:

حضرات جب میں دیکھتا ہوں کہ ایسے نازک موقع کی صدارت کے لیے آپ کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی تو مجھے آپ کی جانب سے عزت اور اعتماد کا ایسا عظیم پیام ملتا ہے جس کو میں اپنے استحقاق کا نہیں بلکہ صرف آپ کے فیاضانہ حسن ظن ہی کا نتیجہ سمجھ سکتا ہوں [۵۳]"

"انڈیا ونس فریڈم" میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریر کیا ہے کہ دہلی کانگریس کا فیصلہ ان کی توقعات کے مطابق ہوا۔ اس میں طے ہوا کہ

---

۵۲ خطبات آزاد: مالک رام ص ۱۵۷

۵۳ خطبات آزاد: مالک رام ص ۱۵۸

) Prochanger (اور) Nochanger (دونوں اپنے اپنے پروگرام کے مطابق کام جاری رکھیں۔ چنانچہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، شری راجگوپال اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے تعمیری کام اپنے لیے منتخب کیا اور سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں نے سوراج پارٹی کی بنیاد ڈالی اور انتخاب میں مقابلہ کی تیاریاں شروع کیں۔ جس کی وجہ سے بڑا جوش و خروش پیدا ہوگیا۔ چنانچہ مرکزی اور صوبائی سطح پر بہت سے لوگ اس تحریک کے ساتھ ہوگئے۔) Nochanger (کا خیال تھا کہ کونسلوں میں داخل ہونے سے گاندھی جی کی قیادت کمزور پڑ جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ مرکزی کیبنٹ میں سوراج پارٹی نے گاندھی جی کی رہائی کی تجویز پاس کرلی اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ تجویز پاس کرنے سے پہلے ہی گاندھی جی رہا کر دئے گئے تھے۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ سے مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ابتداء سے گہرا تھا، وہ اس کی ترقی سے ہمیشہ دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ جب ۷، فروری ۱۹۲۳ء کو دوسرا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا تو اس میں ملک کے علماء و فضلاء شریک ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر پی۔ سی۔ رائے، حکیم اجمل خاں اور مولانا آزاد اس جلسہ میں پیش پیش تھے۔ جلسہ کی صدارت ڈاکٹر پی۔ سی۔ رائے نے کی۔

یکم اپریل ۱۹۲۳ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی خواہش اور

سرپرستی میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے کلکتہ سے ماہنامہ "الجامعہ" عربی رسالہ جاری کیا۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی سے عرب دنیا آگاہ رہے اور ان کی ہمدردیاں ہندوستانیوں کے ساتھ ہوں۔ یہ رسالہ خلافت تحریک کی تائید کرتا تھا۔ شریف حسین کا مخالف تھا اور اتحاد اسلامی کا علمبردار تھا۔

اس رسالہ نے بھی زیادہ عمر نہیں پائی۔ آخری شمارہ مارچ ۱۹۲۴ء کا نکل کر بند ہوگیا۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں ملک کے حالات نے نئی صورتیں اختیار کیں۔ کانگریس کی ایک جماعت نے اسمبلی اور کاؤنسلوں کے لیے کھڑے ہو کر ملک کی سیاسی خاموشی میں ہلچل پیدا کردی۔ گاندھی جی جب ۵ فروری کو رہا ہوئے تو نئی امید میں فروغ پانے لگیں۔ ادھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تفرقہ اور پیچ در پیچ معاملات جو ۱۹۲۳ء سے شروع ہوئے تھے اب زیادہ وسیع اور گہرے ہوگئے تھے۔ چنانچہ پورا سال گزر گیا اور مولانا آزاد کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملی۔

کانگریس اور جمعیتہ العلمائے ہند کا ملا جلا اجلاس ۲۷ سے ۲۹ جون (۱۹۲۴) تک مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں احمد آباد میں ہوا جس میں اپنی صدارتی تقریر میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندو مسلم اتحاد پر بہت زور دیا۔

گاندھی جی بھی ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کے لیے بے حد فکر مند تھے۔ اسی جذبہ سے وہ ۹ ستمبر ۱۹۲۴ء کو دہلی آئے اور ڈاکٹر انصاری کے یہاں[۵۵] قیام

---

[۵۵] ہسٹری آف دی کانگریس۔ بی۔ پتابھی سیتا رمیا جلد اول ص ۲۷۶ پر قیام کی جگہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کیا۔ جہاں ہندوستانیوں میں اتحاد اور اتفاق قائم کرنے کے لیے اکیس دن کا برت شروع کیا۔ جس کی وجہ سے سارے ہندوستان میں کھلبلی پیدا ہو گئی۔ گاندھی جی سے محبت کرنے والے اور عقیدت رکھنے والے فکرمند ہو گئے۔ چنانچہ ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو مولانا آزاد کی صدارت میں تمام فرقوں کا جلسہ ہوا، جس کا سلسلہ ۲ اکتوبر تک رہا جس میں مولانا آزاد کے علاوہ، مولانا شوکت علی، لالہ لاجپت رائے، کے۔ ایف۔ نریمن، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور بابو راجندر پرشاد شریک رہے[۵۶]۔ شرکائے جلسہ نے امن اور آزادی کی قسمیں کھا کر گاندھی جی سے برت توڑنے کی درخواست کی۔ بہت مشکلوں سے گاندھی جی راضی ہوئے چنانچہ ۸ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو گاندھی جی تکیہ کے سہارے بٹھائے گئے، اور لوگوں کے اصرار پر چرخہ چلا کر، پرارتھنا کر کے اور بھجن گا کر نارنگی کے رس سے برت توڑا[۵۷]

ادھر جمعیت خلافت کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ پٹنہ نے ۲۱، ۲۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کو طے کیا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی سرکردگی میں ایک وفد مولانا محمد عرفان، مولانا ظفر علی خاں، مولانا سید خورشید حسین، مولانا عبدالماجد بدایونی اور جناب شعیب قریشی پر مشتمل حجاز بھیجا جائے۔ یہ وفد جہانگیر نامی جہاز سے ۲۶ اکتوبر کو حجاز روانہ ہوا۔ لیکن سید

(گذشتہ صفحے کا بقیہ) مولانا محمد علی کا مکان تحریر ہے۔

۵۶ ہسٹری آف دی کانگریس: بی۔ پٹا بھی سیتا رمیا جلد اوّل صفحہ ۲۷۰ دیکھئے

۵۷ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۲۷۶

سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد بدایونی اور سید خورشید حسین وفد کے ساتھ نہ جا سکے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس زمانے میں جمعیت خلافت مرکزیہ کے صدر تھے۔ انھوں نے وفد کی رہنمائی کے لیے ایک یادداشت مرتب کی تھی ملاحظہ کیجئے:

"جیسا کہ معلوم ہے وفد کے جانے کا مقصد یہ ہے کہ

(الف) مسلمانان ہند کی جانب سے امیر ابن سعود کا شکریہ ادا کرے کہ انھوں نے ایک اہم خدمت اسلامی انجام دی ہے کیوں کہ یہ پہلا موقع ہے کہ باقاعدہ منتخب وفد ان سے مل رہا ہے۔

(ب) مجوزہ موتمر اسلامی کے لیے امیر موصوف سے گفت گو اور اس باب میں ان کے افکار سے جمعیۃ خلافت کو وقتاً فوقتاً مطلع کرنا اور اس امر پر غور کرنا کہ اس کے لیے ایک مجلس استقبالی کے قیام، اصول و قواعد ضروریہ، نیابت اور بلاد اسلامیہ سے نامہ و پیام کے ضروری انتظامات کیوں کر عمل میں آئیں؟

استقبالی کمیٹی جسے عربی میں "لجنتہ التحضیریہ" کہتے ہیں، نہایت ضروری ہے لیکن اس کے اصول کیا ہوں؟ بلاد اسلامیہ کی تقسیم کیوں کر عمل میں آئے، نیابت اور انتخاب نمائندگان کے لیے کیا بنیادی قواعد ہوں؟ ان امور کے

طے کرنے میں توقف کرنا چاہیئے۔ خلافت کمیٹی ایک
یاد داشت مرتب کرکے بہت جلد بھیجے گی۔ میں نے
مصر سے خط وکتابت شروع کردی ہے اور امید ہے
کہ اس باب میں ہندوستان اور مصر دونوں مشترکہ
کارروائی کریں گے۔

ابوالکلام آزاد[۵۵]
صدر
جمعیت خلافت مرکزیہ

۱۶ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو "پیغام" کا آخری شمارہ نکل کر بند ہوگیا جس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد چند برس خاموش رہے لیکن ۱۹۲۷ء تک آتے آتے ایک بار انھوں نے روزانہ اخبار نکالنے کا ارادہ کر لیا مگر وہ اس خواہش کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔ چنانچہ "الہلال" کے دوبارہ اجرا کی طرف رجوع ہوئے اور اس مقصد میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس کا پہلا شمارہ "الہلال ثانی کے نام سے ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء کو منظر عام پر آیا لیکن ابھی پورے چھ مہینے ہی جاری رہ سکا تھا کہ ۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو آخری شمارہ نکل کر بند ہوگیا۔ بند کیوں ہوا اس کی وجہ نہ تو الہلال ثانی کے آخری شمارے میں بتائی گئی اور نہ کہیں اور اس کا اظہار کیا گیا۔ مجموعی طور سے "الہلال ثانی" نے اپنے اثرات بھی نہیں چھوڑے۔ پہلے دور کے الہلال کی

---

۵۵ مکاتیب ابوالکلام آزاد: ابوسلمان شاہجہانپوری ص ۱۴۸

بات کچھ اور تھی اس کے مشمولات میں جوش اور ولولہ کے ساتھ اعتماد اور یقین ہوتا تھا۔ ان کے مطالعہ سے آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ اُردو واں ہندوستانیوں میں آزادی اور اتحاد کا جذبہ بیدار کرنے کی اس ہفتہ وار کے ذریعہ کوشش کی جارہی تھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا تھا کہ بہت جلد اس نے بڑی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ عالم اسلام کے لیے اس کا دھڑکتا دل اس بات میں کامیاب نظر آتا ہے کہ اس کی وجہ سے سارے مسلمانوں کے دل دھڑکنے لگے تھے۔

لیکن دوسرے دور کے الہلال میں صرف نام ہی باقی رہا تھا، اس کا مزاج اور معیار وہ نہ رہا تھا اس لیے اس دور کے شمارے اتنے مقبول نہیں ہوئے جتنے دور اول کے ہوئے تھے۔ اس دور کے معاونین میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے علاوہ غلام احمد جامعی اور چراغ حسن حسرت کے نام لیے جاتے ہیں۔

ہندو مسلم فرقہ وارانہ ذہنیت کو کم کرنے اور آپس میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی غرض سے کل ہند کانگریس کا ہنگامی جلسہ ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۷ء کو کلکتہ میں ہوا، اس کی صدارت سری نواس آئینگر نے کی۔ انھوں نے گائے اور باجے کی اس منظور شدہ تجویز کو پیش کیا کہ کسی ہندوستانی کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر اپنے اثرات ڈالنے سے پرہیز کرنی چاہیے۔ ہندوؤں کو باجا بجانے کا حق ہے مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے کا، لیکن مسلمانوں کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ عام جگہ یا مندروں کے سامنے نہ کریں۔ اسی طرح ہندوؤں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ عبادت یا نماز میں خلل نہ ہو،— چونکہ شری نواس آئینگر

کی صحت اچھی نہ تھی اس لیے وہ جلد چلے گئے ان کے جانے کے بعد صدارت کی ذمہ داری مولانا آزاد کو سونپی گئی۔ اس جلسہ میں مولانا محمد علی، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر انصاری اور مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد پر تقریریں کیں۔

اسی ۱۹۲۷ء کے آخر میں سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا تو اس کے خلاف سارے ہندوستان کے جذبات برانگیختہ ہو گئے۔ نومبر ۱۹۲۷ء کی کسی تاریخ کو ایک جلسے میں جس کی صدارت مولانا آزاد نے کی اس کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔

بات کچھ اور بھی اس کے مشمولات میں جوش اور ولولہ کے ساتھ اعتماد اور یقین ہوتا تھا۔ اُن کے مطالعہ سے آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ اُردو داں ہندوستانیوں میں آزادی اور اتحاد کا جذبہ بیدار کرنے کی اس ہفتہ وار کے ذریعہ کوشش کی جارہی تھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا تھا کہ بہت جلد اس نے بڑی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ عالمِ اسلام کے لیے اس کا دھڑکتا دل اس بات میں کامیاب نظر آتا ہے کہ اس کی وجہ سے سارے مسلمانوں کے دل دھڑکنے لگے تھے۔

لیکن دوسرے دور کے الہلال میں صرف نام ہی باقی رہا تھا، اس کا مزاج اور معیار وہ نہ رہا تھا اس لیے اس دور کے شمارے اتنے مقبول نہیں ہوئے جتنے دورِ اوّل کے ہوئے تھے۔ اس دور کے معاونین میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے علاوہ غلام احمد جامعی اور چراغ حسن حسرت کے نام لیے جاتے ہیں۔

ہندو مسلم فرقہ وارانہ ذہنیت کو کم کرنے اور آپس میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی غرض سے کل ہند کانگریس کا ہنگامی جلسہ ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۷ء کو کلکتہ میں ہوا، اس کی صدارت سری نواس آینگر نے کی۔ انھوں نے گائے اور باجے کی اس منظور شدہ تجویز کو پیش کیا کہ کسی ہندوستانی کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر اپنے اثرات ڈالنے سے پرہیز کرنی چاہیے۔ ہندوؤں کو باجا بجانے کا حق ہے مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے کا، لیکن مسلمانوں کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ عام جگہ یا مندروں کے سامنے نہ کریں۔ اسی طرح ہندوؤں کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ عبادت یا نماز میں خلل نہ ہو۔ چونکہ شری نواس آینگر

کی صحت اچھی نہ تھی اس لیے وہ جلد چلے گئے ان کے جانے کے بعد صدارت کی ذمّہ داری مولانا آزاد کو سونپی گئی۔ اس جلسہ میں مولانا محمد علی، سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر انصاری اور مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد پر تقریریں کیں۔

اسی ۱۹۲۷ء کے آخر میں سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا تو اس کے خلاف سارے ہندوستان کے جذبات برانگیختہ ہو گئے۔ نومبر ۱۹۲۷ء کی کسی تاریخ کو ایک جلسے میں جس کی صدارت مولانا آزاد نے کی اس کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔

۱۹۲۸ء کی آمد کے ساتھ سائمن کمیشن کے خلاف ہندوستانیوں میں اشتعال تیز سے تیز تر ہوتا گیا، مولانا نے بھی اسے تیز کرنے کی کوشش کی انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں، راولپنڈی، لاہور، امرتسر اور دہلی میں اس کمیشن کے خلاف تقریریں کیں، جب لاہور پہنچے تو ان کے ساتھ مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری بھی تھے۔ اسلامیہ کالج کے پرنسپل نے مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں کو اپنے کالج میں آنے کی دعوت دی چنانچہ مولانا اور ان کے ساتھی ۲۹ جنوری کو دن کے سوا گیارہ بجے کالج پہنچے۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی تو سب سے پہلے مولانا آزاد نے تقریر شروع کی، انھوں نے کہا کہ پرانی تہذیب کو دنیوی ترقی کے لیے رکاوٹ سمجھا جاتا ہے وہ درست نہیں ہے دراصل مغربی تہذیب مذہب کے لیے خطرہ ہے اور ہماری تباہی کا باعث ہے۔ مولانا نے طلبہ کو دینی دعوت دینے کے ساتھ اپنے سیاسی مقاصد سے بھی آگاہ کیا اور انھیں اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کے ساتھ کہا:

" مسلمانوں کے لیے راہ اعتدال ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا کے کلام اور رسول اللہ صلعم کے احکام کی پیروی اور پابندی۔ مسلمانوں کو قرآن مجید کے مطالعہ پر زیادہ توجہ

گرنی چاہیئے۔ جو ہر حال اور ہر زمانے میں ان کا رہنما ہے یہی
ان کے لیے فلاح و کامیابی کا وسیلہ ہے [۵۹]

مولانا ابوالکلام آزاد نے "انڈیا ونس فریڈم" میں لکھا ہے کہ سائمن کمیشن کے تقرر اور آمد کے ساتھ ساتھ اشتعال بڑھتا گیا، چنانچہ ۳ر فروری ۱۹۲۸ء کو جب یہ کمیشن بمبئی پہنچا تو عوامی بائیکاٹ کی زد میں آگیا۔

اسی سال جب نہرو رپورٹ شایع ہوئی تو مسلمانوں کی ایک جماعت نے اس کو غیر مفید پاکر اس کی مخالفت کی، لیکن مولانا آزاد نے عام جلسہ میں اس کی تائید کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اس کی مخالفت کریں۔ اس لیے انھوں نے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے اس سے متعلق گفتگو کی اور جب اس معاملہ میں انھیں ہر طرح سے اپنا ہم خیال پایا، تو ان سے نہرو رپورٹ کے بارے میں مسلسل مضامین لکھنے کی فرمایش کی اکثر یہ بھی ہوا کہ مولانا، مضامین لکھ کر مولانا ملیح آبادی کو بھیج دیتے کہ وہ خود اپنے نام سے شایع کرادیں۔ بعض خطوط میں انھیں مضمون کے سلسلے میں اس طرح کی رہنمائی کی:

"البتہ ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، نہرو رپورٹ کی حمایت کرتے ہوئے کوئی بات ایسی نہیں لکھنی چاہیئے کہ لوگوں کو مبالغہ کا گمان ہو، رپورٹ اور کانفرنس نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے جو اصول و مبادیات قرار دے دئیے ہیں صحیح ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کو آزادانہ جدوجہد اور سیاسی و اجتماعی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ

---

[۵۹] مولانا آزاد اوران کے ناقد، مرتبہ ام اے شاہد ۳۲

باقی نہیں رہتی۔ بلاشبہ اکثریت چاہے تو اس سے بھی زیادہ امتیازات دے سکتی ہے لیکن معلوم ہے کہ کوئی جماعت امتیازات بخشنے کو تیار نہیں ہوسکتی اور ہندوستان جیسے ملک میں معاً یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک جماعت نے دوسری جماعت کو کوئی خاص امتیاز دیا' یا نہیں بلکہ یہی ہوسکتا ہے کہ کسی جماعت کی آزادانہ ترقی کی راہ میں رکاوٹیں رکھی گئی ہیں یا نہیں ۔ ۵"

اسی خط میں آگے یہ بھی فرمایا:

" علاوہ بریں یہ بات بھی واضح کردیجئے کہ نہرو رپورٹ میں ابھی جزئی ترمیم و تغیر کی پوری گنجائش باقی ہے اور مسائل پر مزید غور وفکر کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے چنانچہ خود ابوالکلام نے اپنے مضامین میں متعدد امور سے اختلاف کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ کمیٹی کو مزید غور وفکر سے انکار نہیں ۔"

۲۵ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کامل آزادی کی تجویز پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس کے ایک اہم جلسہ میں پیش کی جو متفقہ طور پر منظور ہوئی ۔ اس جلسہ میں مولانا آزاد شریک تھے ۔ اس تجویز سے حکومت برطانیہ کو آگاہ کردیا گیا اور اس سے بھی آگاہ کردیا گیا کہ اگر ایک سال کے اندر اسے منظور نہیں کیا گیا تو عوامی تحریک شروع کی جائے گی ۔ برطانوی حکومت نے اسے ماننے سے صاف انکار کردیا ۔

۱۹۲۹ء میں "مجلسِ احرار" کی بنیاد اس جلسہ میں پڑی جس کی صدارت

---

۵ مکاتیب ابوالکلام آزاد : مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری ص ۱۵۱

چودھری افضل حق نے کی۔ اس کے مشورے میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا مظہر علی مظہر کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ یہ نام مولانا آزاد ہی کا دیا ہوا ہے اس کا پہلا اجلاس لاہور کانگریس کے اجلاس کے موقع پر ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو اسی پنڈال میں ہوا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری صدر منتخب ہوئے[۵۶]

جب نمک سازی کے قانون کے خلاف ستیہ گرہ کرنے کا اعلان کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں کیا تو عام طور سے اس کی کامیابی پر شک تھا لیکن بہت جلد اس تحریک نے ملک گیر صورت اختیار کرلی، مولانا ابوالکلام کے اثر سے بنگال پنجاب اور سرحد کے علاقوں میں بے شمار مسلمانوں نے اس ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ ستیہ گرہ کی اس کامیابی کو دیکھ کر حکومت حیران رہ گئی اور اس نے سخت کارروائی اس طرح کی کہ کانگریس کو غیر قانونی قرار دیا اس کے صدر اور ممبران ورکنگ کمیٹی کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ لیکن ہر صدر کو یہ اختیار پہلے ہی دے دیا گیا تھا کہ وہ اپنا جانشین نامزد کرلے۔ پہلے گاندھی جی گرفتار ہوئے پھر مولانا ابوالکلام آزاد گرفتار ہوئے وہ صرف گیارہ دن صدر رہے۔ گرفتاری سے پہلے مولانا آزاد نے ڈاکٹر انصاری کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا مولانا ایک تقریر کے سلسلے میں ۴ مئی ۱۹۳۰ء کو میرٹھ میں گرفتار ہوئے تھے اور وہیں میرٹھ جیل میں تقریباً ۹ ماہ رکھے گئے[۵۷] یہیں ۱۷ نومبر ۱۹۳۰ء کو مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کا دیباچہ قلمبند کیا۔ برطانوی حکومت اور ہندوستانیوں کے

---

[۵۶] سید عطاء اللہ شاہ بخاری: شورش کاشمیری ۲۵۳

[۵۷] مولانا آزاد نے یہ مدت ڈیڑھ سال بتائی ہے۔ دیکھیے ہماری آزادی: مترجمہ محمد مجیب ص ۲۹

درمیان اس زمانے میں عجیب کشمکش کی صورت پیدا ہوگئی تھی آخر کار لارڈ ارون نے جنوری ۱۹۳۱ء میں ارون گاندھی معاہدے کے تحت تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔

اِسی زمانے میں ۳۱ مارچ و یکم اپریل کو جمعیۃ علمائے ہند کا سالانہ جلسہ کراچی میں منعقد ہوا تھا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔ اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن خاں لدھیانوی اور دوسرے رہنما اور رکن مجلس عاملہ جمعیۃ علمائے ہند قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے اس اجلاس میں ان کی گرفتاری پر غم و غصہ کا اظہار کیا گیا اس کے ساتھ سول نافرمانی کی تحریک کو جاری رکھنے اور رضا کاروں کی بھرتی کی تجویزیں منظور ہوئیں[۶۳]

۱۹۳۱ء کے اواخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور و معروف علمی کام ترجمان القرآن جلد اول کی اشاعت تکمیل کو پہنچی۔ اس کام کی ابتدا ۱۹۱۶ء میں "البلاغ" کے صفحات پر ہوئی تھی۔

۱۹۳۲ء میں کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کی۔ جب ۱۵ فروری کو قائم مقام ڈکٹیٹر سردار سردول سنگھ کویشر کو گرفتار کر لیا گیا تو مولانا ابوالکلام آزاد ان کی جگہ ڈکٹیٹر مقرر ہوئے۔ حکومت نے مولانا آزاد پر یہ پابندی لگائی کہ وہ ایک مہینہ تک سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے۔ لیکن مولانا آزاد اس حکم کے پابند کیسے ہوسکتے تھے اس کی کھل کر خلاف ورزی کی چنانچہ دلّی ہی میں نظر بند کر دئے گئے۔ یہ ان کی چوتھی بار

---

[۶۳] دیکھئے تاریخ جمعیۃ علمائے ہند: مرتبہ اسیر ادروی ص ۴۷

[۶۴] آزاد - معمار اتحاد و آزادی: علی جواد زیدی؛ انوار ابوالکلام آزاد ص ۲۰۲

گرفتاری تھی۔ جہاں سے یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو رہائی ہوئی۔

ترجمان القرآن جلد اوّل کی اشاعت کے بعد مولانا آزاد کے معترضین نے اعتراضات کی بوچھار شروع کی۔ ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ نجاتِ اخروی کے لیے ایمان بالرسالت ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے "لاتقربوا الصلوٰة" کے ساتھ "وانتم سکارٰی" نظرانداز کر دیا تھا۔ بعد میں مولانا نے اپنے بعض احباب اور معتقدین کے پوچھنے پر مسئلہ کو واضح کر دیا تھا ـــــ اس سلسلے کے خطوط یکجا کر کے ۱۹۵۹ء میں کتابی صورت میں "میرا عقیدہ" کے نام سے شایع کر دیا گیا ہے۔

۱۹۳۴ء کے آخری مہینوں میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بالی گنج کلکتہ کی جامع مسجد میں مسلمانانِ کلکتہ کی خواہش اور اصرار پر نماز جمعہ کی امامت قبول کی تھی۔ اس کے ساتھ خطبات کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جن میں خاص طور سے اجتماعی زندگی اور اس کے اعمال، امتیازات اور خصائل پر زور دیا جاتا تھا۔ مولانا آزاد کا خیال تھا کہ ان چیزوں کو ترک کر دینے نے مسلمانوں کو تنزل سے دو چار کیا اور ان کے اختیار کرنے سے کھوئے ہوئے وقار کی واپسی ہوگی۔ دسمبر ۱۹۳۵ء کے خطبہ عیدالفطر میں مولانا آزاد نے فرمایا تھا:

> "احکام شریعت پر کامل ۳۵ سال تک میں نے پوری طرح سے غور و خوض کیا اور اس ۳۵ سال کے عرصے میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جس کی کوئی صبح کوئی شام اس فکر سے خالی گزری ہو اور بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واضح شریعت کا منشا یہ ہے کہ اس کے احکام ایک اجتماعی نظام

کے ماتحت اجراء پائیں، لیکن مسلمانوں نے اس جماعتی نظام کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔"[۶۵]

اس اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا آزاد نے اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی احکامِ شریعت پر غور و خوض شروع کر دیا تھا اور شریعت کا مطالعہ ان کی زندگی میں نہایت اہمیت رکھتا تھا۔ اِسی خطبہ میں مولانا نے کہا تھا:

"کاش مجھ میں ایسی قوت ہوتی یا وہ شے موجود ہوتی جس کی مدد سے میں تمھارے مقفل قلوب کے پٹ کھول سکتا تاکہ میری آواز تمھارے کانوں میں نہیں بلکہ دل میں سما سکتی اور تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتے۔"

اس اقتباس سے مولانا آزاد کے ان دلی احساسات و جذبات کا جو قوم کی اجتماعی زندگی کے لیے رکھتے تھے اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

۱۹۳۵ء میں مولانا آزاد دوسرے مشاغل کے ساتھ ساتھ ترجمان القرآن جلد دوم کی کتابت و طباعت کے کام میں مصروف رہے اسی زمانے میں لوگوں کے اصرار پر وہ جنوری ۱۹۳۶ء سے الہلال تیسری بار جاری کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ لیکن اسے ماہنامہ رکھنا چاہتے تھے اگرچہ وہ جانتے تھے کہ ماہوار رسالہ، وہ مقصد پورا نہیں کر سکتا جو ہفتہ وار پورا کر سکتا ہے لیکن حالات سے مجبور تھے، افسوسناک بات یہ ہوئی کہ وہ اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہو پائے۔

---

[۶۵] خطبات جمعات و عیدین: مرتبہ سیف الحق صدیقی ص، بحوالہ تحریک نظم جماعت ص ۹۵

اسی ۱۹۳۵ء میں قانون حکومت ہند پاس ہوا جس کی رو سے صوبوں کو آزادی و خود مختاری دی گئی تھی، لیکن اس ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس اس نظام کو پسند اس لیے نہیں کر رہی تھی کہ وہ مکمل آزادی کی خواہشمند تھی اس لیے اس نے اسے منظور کرنے سے انکار کردیا اور عرصہ تک وہ اس کے خلاف رہی، کانگریس کا ایک بڑا حصہ انتخاب میں شریک ہونا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ مولانا آزاد کا خیال اس کے برعکس یہ تھا کہ انتخابات میں کانگریس کو ضرور شرکت کرنی چاہیئے۔ اس لیے کہ ایسا نہ کرنے پر وہ لوگ حکومت پر قبضہ کرلیں گے جو اتنے اچھے نہیں ہیں۔ مولانا کا خیال یہ بھی تھا کہ انتخابات میں حصہ لینے سے عوام کی سیاسی تعلیم اور بنیادی مسائل کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مولانا اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ان کی رائے مان لی گئی اور کانگریس نے اس انتخاب میں حصہ لیا۔

لیکن جو لوگ انتخاب میں شریک ہوئے تھے ان میں سے ایک حصے کی رائے تھی کہ عہدے قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال تھا کہ کانگریس کو عہدے بھی قبول کرنے چاہیئں اور بھرپور فائدہ بھی اٹھانا چاہیئے۔ فیصلہ کرنے میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ گورنروں نے مجلس قانون ساز میں جس جماعت کی تعداد کانگریس کے بعد تھی اسے حکومت بنانے کی دعوت دے دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں مضبوط ہونے اور پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔

ادھر وائسرائے سے جو گفت گو ہو رہی تھی اس کے بارے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"وائسرائے سے جو طویل گفت وشنید ہوئی اس کے دوران

میں اس سے زبردستی اس کا وعدہ لینے کی کوشش کی گئی کہ
گورنر وزارتوں کے کام میں دخل اندازنہ ہوں گے۔ جب
وائسرائے نے صورتِ حال واضح کی تو ورکنگ کمیٹی کے بعض
ممبروں نے اپنی رائے بدل دی اور عہدے قبول کرنے کے
موافق ہوگئے [۶۶]"

لیکن چونکہ کانگریس نے اس کی سخت مخالفت کی تھی اس لیے اب کسی کی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ پالیسی بدلنے کی تجویز کی اعلانیہ حمایت کرے۔ جواہرلال اس وقت کانگریس کے صدر تھے ان کے لیے بھی عہدے قبول کرنے کی حمایت کرنی ممکن نہ تھی، چنانچہ وردھا میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ مولانا آزاد بیان کرتے ہیں:

"میں نے دیکھا کہ حقیقت کا اعتراف کرنے میں عجب سا
پس وپیش ہے، اس لیے میں نے صاف الفاظ میں تجویز کیا کہ
کانگریس کو عہدے قبول کرلینا چاہیئے۔" [۶۷]

گاندھی جی نے کچھ دیر گفتگو کے بعد ہی مولانا آزاد کی رائے کی موافقت کی اور اس کے بعد کانگریس نے صوبوں میں وزارت بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ مولانا نے اسے "یادگار فیصلہ"[۶۸] کے نام سے یاد کیا ہے۔

۱۹۳۷ء میں یہ سوال مولانا آزاد سے بار بار کیا جارہا تھا کہ مسلمانوں

---

[۶۶] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۴۴
[۶۷] // // // // ص ۴۴
[۶۸] // // // // ص ۴۴

کو کانگریس سے رشتہ جوڑنا چاہیئے یا نہیں اور اگر چاہیئے تو کیوں؟ ایک خط کے جواب میں مولانا نے ۱۴ مئی ۱۹۳۷ء کو سردار محمد اکبر خاں کو لکھا:

"۔۔۔ مسلمانوں کو اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیئے تو صرف اس لیے کہ ادائے فرض کا تقاضا یہی ہے اور اس کی بنیاد خود اعتمادی ہے نہ کہ کسی طاقت کی خوشامد یا کسی طاقت سے اندیشہ[۶۹]"

۳۰ جون ۱۹۳۷ء کے مکتوب بنام سردار محمد اکبر خاں میں دوبارہ مسلمان اور کانگریس کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

"بہر حال ۱۹۱۲ء سے میری دعوت مسلمانوں کے لیے یہی رہی ہے کہ جہاں تک ملک کی سیاسی جدوجہد کا تعلق ہے انھیں بلا کسی شرط کے شریک ہونا چاہیئے اور یہ کہہ کر شریک ہونا چاہیئے کہ وہ محض ادائے فرض کے لیے شریک ہو رہے ہیں اس لیے شریک نہیں ہو رہے ہیں کہ ہندوؤں نے انھیں ان کے مستقبل کی طرف سے مطمئن کر دیا ہے۔ مستقبل کے لیے ان کا تمام تر اعتماد اپنی ہمت اور خود اعتمادی پر ہونا چاہیئے۔ جب تک ان میں یہ احساس باقی رہے گا کہ ان کے حقوق ہیں اور وہ ضایع نہیں ہونے چاہئیں۔ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کہ انھیں ضایع کر سکے[۷۰]"

---

۶۹ آئینہ ابوالکلام آزاد: مرتبہ عتیق صدیقی ص ۱۷۸
۷۰ " " " " ص ۱۸۲

یہ وہ زمانہ ہے کہ مولانا آزاد اس احساس میں بھی مبتلا ہو گئے تھے کہ زمانہ نے ان کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ انھوں نے ناقدری کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ اس عہد کے آدمی نہیں تھے جس میں پیدا ہوئے اس بات کا اظہار انھوں نے اپنے مکتوب ۲۲ دسمبر ۱۹۳۷ء بنام غلام رسول مہر اس طرح کیا ہے:

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا، غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی [۱]"

۱۹۳۸ء میں مولانا آزاد عرق النسا کی تکلیف میں مبتلا رہنے کے باوجود سیاسی جدوجہد میں پوری طرح مصروف رہے اور اس مصروفیت میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان کانگریس سے کسی حد تک بدظن نظر آرہے تھے۔ جس کی وجہ سے مولانا بے حد فکرمند تھے اور چاہتے تھے کہ صدر دفتر میں ایک دو آدمی ایسے رکھے جائیں جو مسلمانوں کی شکایات کی تحقیقات بھی کریں اور انسداد کا راستہ بھی نکالیں [۲]"

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جنگ عظیم چھڑ گئی جس کی وجہ سے ہندوستان میں بھی خوف وہراس کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس وقت کانگریس کی صدارت کی بڑی اہمیت تھی۔ ایک سال پہلے مولانا آزاد نے صدارت قبول کرنے

---

[۱] نقش آزاد: غلام رسول مہر ص ۱۵۰

[۲] دیکھئے تبرکات آزاد، غلام رسول مہر ص ۹۱

سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب وہ مجبور ہو گئے تھے اس لیے کہ انھوں نے سوچا:
" ایسے موقع پر انکار کرنا فرض کی انجام دہی سے گریز کرنا ہوگا" ۳۳ے
جنگ کے دوران میں ایک بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوگیا کہ ہندوستان اس میں شریک ہو یا نہ ہو۔ اس سوال پر مولانا آزاد کا گاندھی جی سے اختلاف ہوگیا۔ مولانا آزاد کا خیال تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو ہندوستان کو جمہوری طاقتوں سے مل جانا چاہیئے۔ لیکن مسئلہ یہ بھی تھا کہ خود ہندوستان آزاد نہیں تھا' وہ دوسرے ملکوں کی آزادی کے لیے کیوں کر لڑ سکتا تھا اگر حکومت برطانیہ فوراً ہندوستان کو آزاد کر دیتی تو اس کا فرض ہو جاتا کہ وہ اس آزادی کے بدلے سب کچھ قربان کر دے ۴۴ے اس لیے مولانا کا خیال تھا کہ جنگ کے اس نازک دور میں ان کو جس حیثیت سے کہا جائے خدمت کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ اسی وجہ سے گاندھی جی نے دوبارہ ان سے صدر بننے کی خواہش ظاہر کی تو وہ تیار ہو گئے ۱۵ فروری ۱۹۴۰ء کو صدارت کے سلسلے میں مقابلہ ام۔ این۔ رائے سے ہوا جس میں مولانا کامیاب ہوئے۔ مولانا آزاد کو ۱۸۶۴ ووٹ ملے جبکہ رائے صاحب کو ۱۸۳ ووٹ ملے ۵۵ے"

انتخاب میں کامیاب ہونے کے بعد مولانا نے ڈاکٹر راجندر پرشاد سے صدارت کی ذمہ داریاں لے لیں اور ورکنگ کمیٹی کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔

۵۳ے ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد مترجمہ محمد مجیب ص ۶۷
۵۴ے " " " " ص ۶۸
۵۵ے The History of The Congress : B. Pattabhi Sitaramayya
جلد ۲ ص ۱۶۶

جس میں حسب ذیل دس ممبران رکھے گئے :

سروجنی نائیڈو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، سیٹھ جمنالال بجاج (خازن)، جی۔بی۔ کرپلانی (جنرل سکریٹری) خان عبدالغفار خاں، بھولا بھائی دسائی، شنکر راؤ دیو، پرفلا چندر گھوش، راجندر پرشاد اور خود مولانا آزاد۔ اِن کے علاوہ جواہرلال نہرو، راجگوپال اچاریہ، ڈاکٹر سید محمود اور آصف علی بھی ممبر بنا دئے گئے۔ پندرھویں ممبر کے نام کا اعلان بعد میں کرنا تھا۔ لیکن اجلاس کے فوراً بعد گرفتاری عمل میں آگئی، اس لیے اس کا انتخاب عمل میں نہ آسکا اور وہ جگہ خالی رہی۔[۵۲]

یہ بات کہی جاچکی ہے کہ جنگ کا یہ زمانہ کانگریس کے لیے مشکل پیدا کیے ہوئے تھا اس وقت یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ آئندہ کیا ہوگا۔ ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں کے غیر مستحکم حالات کے اثرات ہندوستان پر پڑ رہے تھے۔ ہندوستان کے اندرونی اختلافات اپنی جگہ کام کر رہے تھے مولانا آزاد صدر کی حیثیت سے خواہشمند تھے کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد ہمارا رشتہ جمہوری طاقتوں کے ساتھ جڑا رہے۔ ہندوستان کو جمہوریت کے حصول سے بڑی دلچسپی تھی اور اس کے حصول میں غلامی رکاوٹ بنی ہوئی تھی لیکن گاندھی جی کے سامنے Pacifism یعنی عدم تشدد پر مبنی امن عالم تھا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں :

"مگر گاندھی جی اپنی رائے بدلنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ہندوستان کو ہرحالت میں جنگ سے الگ

---

[۵۲] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد مترجمہ محمد مجیب ص ۱، – ۲،

رہنا چاہیئے۔ انھوں نے وائسرائے سے ملاقات کرکے اپنے
خیالات بیان کیے۔ انھوں نے برطانوی قوم کے نام ایک
کھُلا خط لکھ کر اس سے التجا کی کہ ہٹلر سے لڑنے کے بجائے
وہ اس کا روحانی طاقت سے مقابلہ کرے۔ ۵۸"

لیکن گاندھی کی التجا رائیگاں گئی۔ یہ وقت ان کے لیے پریشان کن تھا۔ وہ دیکھ بھی رہے تھے اور محسوس بھی کر رہے تھے کہ جنگ کی وجہ سے دنیا تباہ ہو رہی ہے اور وہ اس بربادی کو روک نہیں سکتے، جس کی وجہ سے ان کے حصّہ میں بے حد اضطراب اور پریشانی تھی۔

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں اس مسئلہ پر اختلاف تھا، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، سری راج گوپال اچاریہ اور خان عبدالغفار خاں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ تھے، لیکن راجندر پرشاد، شنکر راؤ دیو اور اچاریہ کرپلانی گاندھی جی کے ہم خیال تھے۔ وہ اس خیال سے متفق تھے کہ اگر ایک بار یہ بات مان لی جائے کہ آزاد ہندوستان جنگ میں شریک ہو سکتا ہے تو ہندوستان کا عدم تشدد کا دعویٰ بے معنی ہو کر رہ جائے گا لیکن مولانا آزاد کا خیال تھا:

"اس کے برخلاف میں یہ محسوس کرتا تھا کہ آزادی کے لیے
ملک کے اندر جدوجہد کرنا اور ملک کے باہر جارحانہ اقدامات
کا مقابلہ کرنا ایسی صورتیں ہیں جن کے درمیان فرق کرنا
چاہیئے۔ ملک کی آزادی کے لیے لڑنا، ایک بات تھی۔ ملک

---

۵۸ ہماری آزادی: ابوالکلام مترجمہ محمد مجیب ص ۲،

کے آزاد ہونے کے بعد لڑنا دوسری بات اور میرا خیال تھا
کہ ان دونوں مسئلوں کو ایک دوسرے سے الگ
رکھنا چاہیئے ۵۴ ؎"

اسی زمانے میں امریکہ کے مشہور صحافی جان گنتر ہندوستان تشریف لائے اور یہاں کے مختلف سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کی اور کانگریس کی بعض شخصیتوں سے متعلق اپنے اس طرح کے تاثرات کا اظہار کیا:

"اس تثلیث کے منطقہ میں (جو گاندھی جی کے گرد وپیش پیدا ہوگئی تھی) مولانا ابوالکلام آزاد، پٹیل سے اس قدر مختلف ہیں جس قدر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں قطعًا دو مختلف دنیاؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مولانا جن کی عمر پچاس سال ہے ایک عالم دین اور فلاسفر ہیں وہ مشرق کے بزرگ ترین علماء وفضلاء میں سے ایک ہیں ان کی روشن خیالی، مطالعہ کتب کے گہرے ذوق سے وابستہ ہے، وہ ایک علاّمہ ہیں اور ایک جدید تفسیر قرآن کے مرتب کرنے والے ہیں۔ آزاد راسخ العقیدہ ہیں لیکن تجدد پسند ہیں اسلام کی نسبت ان کا زاویہ نظر مصلحانہ ہے۔۔۔۔ آزاد کی بے مثل خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اندر قدیم وٹکسالی تربیت اور جدید وسعت نظر کا ایک مرکب بن گیا ہے۔۔۔ اگر پٹیل کانگریس کی اس تثلیث کا زبردست مکّا ہیں اور مولانا

---

۵۴ ؎ ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد مترجمہ محمد مجیب ص ۸۴۔

اس کے دماغ اور روحانی روشنی کا ایک جزو تو بابو راجندر پرشاد
اس کا دل ہیں۔[۵۸]"

بیرونی ملک کے ایک اہم صحافی کی اس تحریر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مولانا اس وقت تک اپنی سیاسی شخصیت بنانے اور اپنی شناخت کرانے میں نمایاں حد تک کامیاب ہو چکے تھے ان کی کامیابی کی انتہا یہ تھی کہ غیر ملکی صحافی بھی ان کی عظمتوں کے معترف تھے۔

۲۷ مارچ ۱۹۴۰ء کو انڈین نیشنل کانگریس کا ترپنواں اجلاس رام گڑھ (بہار) میں ہوا مولانا ابوالکلام نے اس موقع پر ایک ایسا تاریخی اور سیاسی اہمیت کا خطبہ پڑھا جس سے ان کی شخصیت اور زیادہ نمایاں ہوکر سامنے آئی۔ مولانا آزاد نے کہا:

> "میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ[۱۳] سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضایع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے عُلوم وفنُون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت

---

[۵۸] Inside India. بحوالہ آثار ابوالکلام آزاد: قاضی عبدالغفار ص ۱۰۵-۱۰۴

کرے۔ لیکن اِن تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی اور اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متّحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متّحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"[۵۸]

رام گڑھ کے اجلاس کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا پہلا جلسہ جولائی ۱۹۴۰ء کو پونا میں ہوا جس میں اس عقیدے کو نئے سرے سے پیش کیا گیا تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کا صحیح طریقہ عدم تشدّد ہے جسے قائم رکھنا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ طے کی گئی تھی کہ نازیزم Nazism اور جمہوریت کے درمیان اگر جنگ ہو تو ہندوستان کو چاہیئے کہ جمہوری طاقتوں کا ساتھ دے ——— جب گاندھی جی کو اس کی اطلاع ملی کہ جنگ آزادی کی بنیاد "عدم تشدّد" مان لی گئی ہے تو بہت خوش ہوئے اور مولانا ابوالکلام آزاد کو مبارکباد کا تار بھیجا۔[۵۹]

---

۵۸ خطباتِ آزاد: مرتبہ مالک رام؛ ص ۲۹۷ — ۲۹۸

۵۹ ہماری آزادی؛ ابوالکلام آزاد؛ مترجمہ محمد مجیب ص ۵۷

جولائی ۱۹۴۰ء میں کانگریس کے ممبروں نے جن میں ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی شامل تھے مولانا آزاد کو خط لکھا کہ جنگ کے بارے میں گاندھی جی کی جو رائے ہے اس سے وہ متفق ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ کانگریس ان سے اتفاق کرتی رہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ چونکہ ان کی رائے اس ریزولیشن کے خلاف ہے جسے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی تائید حاصل ہے اس لیے بہتر ہے کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی رکنیت سے علیحدہ ہوجائیں، وہ ورکنگ کمیٹی کے رکن اس لیے منتخب ہوئے تھے کہ صدر کی معاونت کریں گے لیکن چونکہ اختلاف پیدا ہوگیا ہے اس لیے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔

البتہ اس خیال سے کہ مولانا آزاد کو پریشانی نہ ہو وہ اس بات کیلئے تیار تھے کہ جب تک عملی طور سے اختلاف ظاہر نہ ہوجائے وہ ممبری سے علیحدگی اختیار نہیں کریں گے لیکن اگر برطانوی حکومت نے کانگریس کی شرطوں کو منظور کرلیا اور جنگ میں شرکت کا واقعی سوال پیدا ہوا تو وہ استعفیٰ دینے پر مجبور ہوں گے۔

آخر میں یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ اگر یہ باتیں مولانا آزاد کو منظور نہیں ہیں تو اس خط کو استعفیٰ سمجھیں اس پر چار حضرات جواہر لال نہرو، راجگوپال اچاریہ، آصف علی اور سید محمود کے علاوہ تمام ممبران ورکنگ کمیٹی کے دستخط تھے۔

مولانا آزاد کو اس خط کے پڑھنے پر بڑا رنج ہوا۔ عبدالغفار خاں جو مولانا آزاد کے نہایت معتبر اور مخلص ہمنواؤں میں سے تھے۔ ان کی رائے میں تبدیلی ہوچکی تھی۔ مولانا کو اس کی امید نہ تھی کہ ان کے ساتھی اس طرح

کا خط لکھیں گے انھوں نے فوراً جواب دیا کہ اُن کی شرطیں انھیں منظور ہیں اور درخواست کی کہ ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے علیٰحدگی اختیار نہ کریں۔

مولانا آزاد بیان کرتے ہیں کہ وائسرائے ہند نے اگست ۱۹۴۰ء میں انھیں اس تجویز پر کہ "ایگزیکیٹو کاؤنسل کے ممبر اور اس کے اختیارات بڑھا دئے جائیں اور اس طرح کانگریس کو حکومت میں شریک کیا جائے"[۹۸۲] پر غور کرنے کی دعوت دی۔ لیکن انھوں نے بغیر اپنے دوسرے ساتھیوں سے رائے لیے ہوئے انکار کر دیا۔ گاندھی جی نے مولانا کے اس فیصلہ کی تائید کی اور اسے خدا کی رحمت[۹۸۳] قرار دیا۔ لیکن ایسے حالات میں یہ بات زیرِ غور تھی کہ کانگریس کو کیسا قدم اٹھانا چاہیئے۔ محض خاموش تماشائی رہنا مناسب نہ تھا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ عورتوں اور مردوں دونوں کو جنگ میں ہندوستان کو لپیٹنے کے خلاف انفرادی طور پر احتجاج کرنا چاہیئے کہ وہ جنگ کے خلاف ہیں۔ اس سلسلہ میں گرفتار ہونے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ مولانا آزاد کی رائے تھی کہ:

" جنگ کے خلاف اس سے زیادہ وسیع اور زیادہ شدید تحریک ہونی چاہیئے"[۹۸۴]

لیکن گاندھی جی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے تو انفرادی ستیہ گرہ شروع کی گئی چنانچہ ونوبا بھاوے پہلے ستیہ گرہی، چنے گئے۔ جواہرلال نہرو

---

۹۸۲ ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۷۷

۹۸۳ 〃 〃 〃 〃 ص ۷۷

۹۸۴ 〃 〃 〃 〃 ص ۸۰

نے اپنے آپ کو دوسرے ستیہ گرہی کی حیثیت سے پیش کیا اس طرح کچھ اور بھی شامل ہوئے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

> ”اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدم تشدد کے مسئلہ میں میرے اور گاندھی جی کے بنیادی اختلاف کے باوجود جو پروگرام عمل میں آیا اس پر ہم دونوں متفق تھے[۸۵]“

اس دوران میں مولانا آزاد حالات کا جائزہ لینے کے لیے پنجاب گئے۔ واپسی پر ”پرشوتم داس پارک“ الٰہ آباد میں ۱۳/دسمبر ۱۹۴۰ء کی تقریر کے جرم میں پانچویں بار گرفتار[۸۶] کر لیے گئے انھیں اٹھارہ (۱۸) مہینے کی سزا[۸۷] دی گئی اور نینی جیل (الٰہ آباد) میں رکھا گیا۔ جہاں بعد میں کیلاش ناتھ کاٹجو بھی لائے گئے تھے۔ لیکن مولانا پوری سزا جیل میں کاٹنے سے بچ گئے اس لیے کہ جنگ کی نوعیت بدل گئی اور اس سے ساری دنیا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

پہلا حادثہ جون ۱۹۴۱ء میں جرمنی کا روس پر حملہ تھا اور اس کے چھ مہینے کے اندر جاپان کا ۷/دسمبر ۱۹۴۱ء کو پرل ہاربر Pearl Harbour پر حملہ۔ جس سے یہ جنگ عالمگیر بن گئی، شروع میں جاپان کو کامیابیاں حاصل ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کے اثرات ہندوستان پر پڑنے لگے

---

[۸۵] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۸۰

[۸۶] ہسٹری آف دی کانگریس جلد دوم: پٹابھی سیتارمیّہ ص ۲۸۶

[۸۷] انڈیا ونس فریڈم (ہماری آزادی) میں مولانا آزاد نے قید کی مدت دو سال بتائی ہے۔

اور خوف محسوس کرنے لگے کہ ہندوستان کہیں جنگ کی لپیٹ میں نہ آجائے۔
ادھر امریکہ نے زور دینا شروع کیا کہ ہندوستان کے مسئلہ کو سلجھایا جائے اور اسے خوشی کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے پر آمادہ کیا جائے چنانچہ برطانیہ نے اپنی پالیسی میں تبدیلی پیدا کی۔

۴؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو مولانا آزاد اور جواہرلال نہرو ۱۴ مہینے کی گرفتاری کے بعد قید سے رہا کیے گئے۔ رہائی کے بعد مولانا آزاد کن قلبی کیفیات سے گزرے ملاحظہ کیجئے:[۵۸]

"مجھے رہائی کا حکم ملا تو میں بڑی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا دراصل آزاد کیے جانے سے میری خودداری کو صدمہ پہنچا اس سے پہلے ہر موقع پر جب میں جیل سے نکلا تو میرے دل میں محدود کامیابی کا احساس ہوا کرتا تھا۔ اس مرتبہ دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی کہ اگرچہ لڑائی دو برس سے زیادہ جاری رہ چکی تھی پھر بھی ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے کوئی موثر اقدام نہیں کرسکتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ ہم حالات کے مارے ہوئے لوگ ہیں اپنی تقدیر کے مالک نہیں ہیں[۵۹]"

رہائی کے بعد مولانا آزاد نے ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ۵؍جنوری ۱۹۴۲ء کو

---

[۵۸] ہسٹری آف دی کانگریس جلد دوم؛ پٹابھی سیتارمیہ صفحہ ۲۲۶ پر ۳؍دسمبر ۱۹۴۱ء اور قید کی میعاد ۱۴ مہینے درج ہے۔ معلوم نہیں چودہ مہینے کس طرح لکھا۔ اور غبار خاطر مرتبہ: مالک رام صفحہ ۱۹ پر ۴؍دسمبر درج ہے۔

[۵۹] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مرتبہ محمد مجیب ص ۸۳

گاندھی جی کی خواہش سے بارڈولی میں کیا۔ گاندھی جی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ مولانا آزاد گاندھی جی سے ملنے گئے تو ان کو اندازہ ہوا کہ ان کی رائے اب بدل چکی ہے۔ ان کو یقین تھا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو آزاد کرنے پر راضی ہے اگر اہلِ ہند جنگ میں شریک ہو جائیں، لیکن مولانا آزاد کا خود اپنا خیال یہ تھا کہ حکومت برطانیہ چاہتی ہے کہ ہندوستان جنگ میں ان کا ساتھ دے لیکن وہ ہندوستان کو آزاد کرنا نہیں چاہتی — اِس دورانِ جنگ میں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک نئی ایگزیکٹیو کونسل بنائی جائے جس کے اختیارات بڑھا دئے جائیں اور اس میں کانگریس کی نمائندگی زیادہ کر دی جائے۔

بارڈولی کے جلسہ کے بعد مولانا آزاد دہلی آگئے تھے جہاں انھیں اطلاع ملی کہ چیانگ کائی شک فروری ۱۹۴۲ء کے ابتدائی دنوں میں ہندوستان تشریف لا رہے ہیں۔ پھر میڈم چیانگ کائی شک کا پیغام مولانا آزاد کو ملا کہ وہ بھی ساتھ آ رہی ہیں۔ ۹ فروری کو دونوں دہلی پہنچے مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو دونوں ان سے ملنے ۱۱ فروری کو گئے، چیانگ کائی شک نے گفتگو کے دوران میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ غلام قوم دو طریقوں ہی سے کسی ایک کے ذریعہ سے آزادی حاصل کر سکتی ہے۔ یا تو وہ طاقت کے ذریعہ غیر ملکی آقاؤں کو باہر نکال سکتی ہے یا پھر آہستہ آہستہ آزادی کی منزل پر پہنچ سکتی ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ انھیں یقین ہے کہ اگر ہندوستان دانشمندی سے کام لے گا تو جنگ سے فائدہ اٹھا کر آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ روانگی سے پہلے چیانگ کائی شک نے حکومت برطانیہ سے پُر زور درخواست کی کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ ہندوستان کو حقیقی معنوں میں سیاسی

اختیارات دے۔[۹۰]

۱۱ مارچ ۱۹۴۲ء کو سر اسٹیفرڈ کرپس کی ہندوستان آنے کی اطلاع ملی۔ بی۔ بی۔ سی نے ۸ بجے شب میں دی ان کے آنے کا سبب یہ بتایا گیا کہ وہ ہندوستانی رہنماؤں کے مشورے اور رضامندی سے نئی ایگزیکیوٹو کاؤنسل کا اعلان کریں گے۔ یہ کاؤنسل جنگ کے زمانے میں کام کرے گی۔ جنگ کے ختم ہونے پر ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں کارروائی کی جائے گی۔

مولانا آزاد اس وقت وردھا میں تھے، جب وائسرائے کے ایک تار سے یہ اطلاع ملی کہ حکومت برطانیہ نے سر اسٹیفرڈ کرپس کو ایک مشن کے کر ہندوستان بھیجا ہے مولانا کو دہلی پہنچ کر ہندوستان کے مسائل پر بات چیت کرنا چاہیئے۔ مولانا نے دعوت قبول کرنے کی اطلاع وائسرائے کو دی اور کرپس کے دہلی پہنچنے کے بعد ۲۹ مارچ ۱۹۴۲ء[۹۱] کو ان سے ملاقات کی۔ کرپس نے وہ بیان جو وہ تیار کر کے لائے تھے، مولانا کو دکھایا۔ مولانا نے جب اسے پڑھا تو معلوم ہوا کہ وائسرائے کی نئی ایگزیکیوٹو کاؤنسل سے متعلق ہے۔ اس صورت میں کاؤنسل کے ممبران مستعفی ہو جائیں گے۔ اسکے بعد کانگریس اور دوسری نمایاں جماعتوں سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے اپنے نامزد کردہ لوگوں کے نام بھیجیں تاکہ نئے ممبروں پر مشتمل نئی ایگزیکیوٹو کاؤنسل

---

[۹۰] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۹۷

[۹۱] پٹا بھی سیتارمیہ نے اپنی کتاب "دی ہسٹری آف دی کانگریس" کے صفحہ ۳۱۴ پر کرپس کی دہلی کی آمد کی تاریخ ۲۳ مارچ تحریر کی ہے اور مولانا آزاد لاہور سے دہلی آئے اور ۲۵ مارچ کو کرپس سے ملاقات کی۔

بنے۔ یہی کاؤنسل دورانِ جنگ میں کام کرے گی اور اختتام جنگ پر حکومت برطانیہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں اقدام کرے گی۔ مولانا آزاد بیان کرتے ہیں :

" تجویز کا خلاصہ گویا یہ تھا کہ موجودہ ایگزیکیوٹو کاؤنسل کے بجائے جس میں انگریز ممبروں کی اکثریت تھی۔ ایک نئی ایگزیکیوٹو کاؤنسل بنے گی۔ جس میں سب ہندوستانی ہوں گے انگریز افسر سکریٹریوں کی حیثیت سے رہیں گے، کاؤنسل کے ممبر نہ ہوں گے لیکن نظامِ حکومت میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی "۔ ۹۲

پھر مولانا نے کرپس سے کاؤنسل کے سلسلے میں مختلف سوالات کیے۔ جن کے جوابات وہ دیتے گئے۔ مولانا آزاد بتاتے ہیں کہ " پہلی ملاقات ختم ہوئی تو کیفیت امید افزا تھی۔ چنانچہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ۲۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو بلائی گئی جس کا سلسلہ طول کھینچ کر ۱۱ اپریل تک پہنچا۔ میٹنگ میں تجویز پر غور کرتے ہوئے مختلف ممبروں نے اپنے مختلف تاثرات کا اظہار کیا۔ گاندھی جی تجویز کے منظور کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ان کو تجویز کا آخری حصہ بھی جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کو فرقہ وارانہ مسئلہ کو طے کرنے کا حق دیا گیا تھا پسند نہ تھا جواہر لال نہرو کی خواہش کرپس کی تجاویز منظور کر لینے کی تھی۔ راجگوپال اچاریہ بھی اُن تجاویز کو منظور کر لینے کے حامی تھے۔

دو دن تک مسلسل ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی لیکن بے نتیجہ ثابت ہوئی۔

---

۹۲ ہماری آزادی : ابوالکلام آزاد، مترجمہ محمد مجیب ص ۱۰۴

چنانچہ مولانا آزاد نے محسوس کیا کہ کرپس سے کئی مسئلوں کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس غرض سے مولانا آزاد کرپس سے پہلی اپریل ۱۹۴۲ء کو دوبارہ ملے۔ تقریباً تین گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ مولانا آزاد نے محسوس کیا کہ:

"۔۔۔ پہلی ملاقات کے بعد سے اس وقت تک سر اسٹیفرڈ کے نقطہء نظر میں بنیادی تبدیلی ہو گئی ہے۔ اب وہ جو جواب دے رہے تھے ان کی کیفیت پہلی ملاقاتوں کے جوابوں سے بالکل مختلف تھی[۹۳]"

اس لیے ۲ اپریل کو جب دوبارہ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو مولانا آزاد نے کرپس سے اپنی اپنی گفتگو اور نتائج سے ورکنگ کمیٹی کو آگاہ کیا جو پہلے کے مقابلہ میں بالکل مختلف تھے۔

اسی دوران میں مولانا آزاد ۲۹ مارچ سے ۱۱ اپریل تک ہر روز صبح و شام ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ رہتے تھے۔ ۲ اپریل کے بعد سے تقریباً ہر شام میں جواہرلال نہرو کے ساتھ کرپس سے ملاقات ہوتی تھی چنانچہ کرپس کی تجویز پر ورکنگ کمیٹی میں بحث ہوتی رہی۔ گاندھی جی اسے منظور کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جواہرلال موافق نظر آنے لگے تھے لیکن مولانا آزاد کا کہنا تھا کہ تجویز اچھی یا بری سمجھنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی کسوٹی تھی یعنی:

"برطانوی حکومت کی تجویز ہندوستان کی آزادی کا پیش خیمہ

---

۹۳ ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۱۰۹

ہو گی یا نہیں ؟ اگر وہ ہو گی تو ہمیں بغیر محفوظات ذہنی کے اسے
مان لینا چاہیے ۔ ورنہ اسے قطعاً نا منظور کر دینا چاہیئے ۔ میرا
واحد معیار ہندوستان کی آزادی تھا۔[۹۴]"

اس زمانے میں لارڈ ویول ہندوستان کے کمانڈر انچیف تھے ۔ کرپس نے مولانا کو مشورہ دیا کہ وہ لارڈ ویول سے ملاقات کریں شاید ان کا خیال ہو کہ ویول کی بات سے مولانا آزاد متاثر ہوں گے جس سے بہتر نتائج برآمد ہوں گے ۔ مولانا آزاد ملنے کے لیے تیار ہوگئے تو انھوں نے ملاقات کا وقت طے کیا اور اپنے ساتھ مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو کو ویول سے ملانے لے گئے وہاں پہنچ کر دونوں کا تعارف کرایا اور خود واپس چلے گئے ۔ لیکن گفتگو بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی کرپس سے ایک ملاقات ۹ / اپریل کی شام کو ہوئی ، اس گفتگو کا جو کچھ بھی ماحصل نکلا اسے مولانا نے ۱۰/ اپریل کی صبح کو ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا ۔ چنانچہ اسی میٹنگ میں طے کیا گیا کہ برطانوی حکومت کی تجاویز ان کی اصلی صورت میں منظور نہیں کی جاسکتیں ۔ اور ۱۰/ اپریل ہی کو مولانا نے کرپس کو لکھا :

" مسودۂ اعلان میں ہندوستان کے مسائل کے بارے میں جو
نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے وہ نہ صرف خود غلط ہے بلکہ اس سے
مستقبل میں اور بھی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔[۹۵]"

---

[۹۴] ہماری آزادی؛ ابوالکلام آزاد ؛ مترجمہ محمد مجیب ص ۱۱۹
[۹۵] " " " " " ص ۱۲۷

جس کے جواب میں کرپس نے لکھا کہ:

"جو تجاویز وہ لائے تھے وہ ہندوستان کے مسائل حل کرنے کے لیے سب سے بہتر تھے۔"

اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ:

"انھوں نے اپنی رائے نہیں بدلی اور مشن کی ناکامی کا سبب کانگریس کو قرار دیا۔"

۱۱ اپریل ۱۹۴۲ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک پریس کانفرنس بلائی اور کرپس مشن کی ناکامی کے اسباب سے آگاہ کیا۔ اہلِ ہند کو اس خبر سے بڑا رنج ہوا، ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اپریل، مئی، جون اِن ہی ہنگاموں میں گزرے۔ مولانا کو اِس کا احساس تک نہیں رہا کہ ان کی شریکِ حیات زلیخا بیگم کی صحت گرتی جارہی ہے۔ غالباً جون ہی کی کسی تاریخ کو ڈاکٹروں کے مشورے سے انھیں رانچی بھیج دیا گیا۔ جولائی میں جب وہ کچھ بہتر ہو کر کلکتہ واپس آئیں تو خود مولانا کلکتہ سے تین ہفتے کے لیے نکل گئے لیکن انفلوئنزا کے اثرات سے نڈھال ہو کر ۲۹ جولائی کو کلکتہ لوٹے۔ اس دوران میں زلیخا بیگم کی صحت پھر خراب ہوگئی تھی اور جب مولانا ۲ اگست کو بمبئی کے لیے روانہ ہوئے تو زلیخا بیگم کی حالت تشویشناک حد تک خراب ہو چکی تھی۔ ۳ اگست کو مولانا آزاد بمبئی پہنچے۔ انفلوئنزا کی حرارت اب بھی تھی لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں میں مصروف ہو گئے ۴ اگست سے ۷ اگست تک اجلاس میں مصروف رہے۔ ۷ اگست کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی کی میٹنگ شروع ہوئی اور ۸ اگست کو رات گیارہ بجے کارروائی ختم ہوئی اور دوسرے ہی دن ۹ اگست کو مولانا کی

چھٹی گرفتاری عمل میں آئی۔ جواہر لال ہنرو، ڈاکٹر سید محمود، آصف علی اور گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے۔ گاندھی جی کے علاوہ تمام حضرات احمد نگر بھیج دیے گئے۔ جہاں قلعہ کا دروازہ ان کے پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس قلعہ میں کل ملا کر ورکنگ کمیٹی کے نو ممبر رکھے گئے۔ مولانا آزاد کو یہیں ۲ر فروری ۱۹۴۳ء کا خط ۷ر فروری کو ملا جس سے معلوم ہوا کہ ان کی شریکِ حیات کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس خبر نے ہی مولانا سے قلبی سکون چھین لیا تھا۔ پھر ۲۳ر مارچ کو اطلاع ملی کہ زلیخا بیگم کی حالت تشویشناک حد تک خراب ہے تو مولانا اندر ہی اندر بے انتہا مضطرب ہو گئے تھے لیکن اس اضطراب کو ظاہر نہیں کر رہے تھے۔

آخر ۱۹ر اپریل ۱۹۴۳ء کو وہ غمناک گھڑی آگئی جس کا ڈر تھا۔ زلیخا بیگم ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہ خبر مولانا آزاد کے لیے قید و بند کی زندگی میں نہایت اذیت ناک تھی لیکن انھوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ انتقال کے وقت بیگم آزاد کی عمر پینتالیس سال کی تھی۔[۹۶] اپریل ۱۹۴۵ء کو قید کی جگہ احمد نگر سے بانکورہ تبدیل کر دی گئی اور چند ماہ بعد جون ۱۹۴۵ء کو یہیں انھیں رہا کیا گیا۔

۱۴ر جون کو وائسرائے ہند نے مولانا آزاد کو گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی، ۲۱ر جون کو برلا ہاؤس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں وائسرائے کے خط پر تبادلۂ خیال ہوا اور طے ہوا کہ اس گول میز کانفرنس میں مولانا آزاد کانگریس کی نمائندگی کریں گے۔ چنانچہ مولانا

---

[۹۶] ہسٹری آف دی کانگریس: پٹابھی سیتا رمیّہ ص ۴۰۷

پروگرام کے مطابق شملہ پہنچے اور دوسرے ہی دن صبح دس بجے وائسرائے سے ملاقات کی۔ انھوں نے مولانا آزاد سے حکومت پر بھروسہ کرنے کی خواہش کی۔ اور وعدہ کیا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد کوشش کی جائے گی کہ ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے۔ چونکہ جنگ ختم ہونے والی ہے اس لیے ہندوستان کا اس میں فائدہ ہے کہ جنگ کو خاتمہ تک پہنچانے میں انگریزوں کے ساتھ تعاون کا ہاتھ بڑھائے مولانا آزاد لارڈ ویول کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے بھی مولانا آزاد کی تعریف اس انداز سے کی کہ لوگ جو مولانا کی خوبیوں سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے ان کے دل میں مولانا کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

۲۴ر جون ۱۹۴۵ء کو سہ پہر میں سردار ہرنام سنگھ کے دولت کدے پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ مولانا آزاد نے وائسرائے کی گفتگو کی تفصیل گاندھی جی کو جو وہیں موجود تھے پیش کی اور وائسرائے کی پیشکش کی منظوری کی سفارش کی۔ طویل بحث و مباحثہ کے بعد میٹنگ میں حسب ذیل باتوں پر زیادہ توجہ دینے کا فیصلہ کیا گیا:

۱ ایگزیکیٹو کاؤنسل کا وائسرائے سے کیا تعلق ہو گا۔

۲ فوج اور لیڈروں کے درمیان دیوار حائل ہے۔ ایسی صورت پیدا کرنی چاہیئے کہ فوج کی لیڈروں سے قربت حاصل ہو۔

۳ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں سے رائے معلوم کیے بغیر ہندوستان کو جنگ میں شریک کر لیا ہے کانگریس کو یہ بات منظور نہیں۔

لارڈ ویول نے مختصر تقریر سے کانفرنس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد مولانا آزاد نے کانفرنس کے سامنے ورکنگ کمیٹی کے نقطہ نظر کو پیش کیا۔ وائسرائے نے

جوابی تقریر کی۔ بحث پورے دن جاری رہی۔ صرف لنچ کے لیے وقفہ رکھا گیا۔ کانفرنس شروع ہوتے کے بعد کانگریس اور لیگ کے اختلافات منظرعام پر آئے اور کوئی مفاہمت پیدا نہ ہوسکی۔ نتیجہ میں شملہ کانفرنس ناکام ہوئی۔

چونکہ مولانا کی صحت خراب رہنے لگی تھی اس لیے ڈاکٹروں کے مشورے سے وہ جولائی میں کشمیر چلے گئے۔ ستمبر میں صحت بہتر ہونے لگی لیکن ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں مولانا کی موجودگی نہایت ضروری تھی، اس لیے ۱۰ ستمبر تک دہلی واپس آگئے اور پھر ۱۴ ستمبر کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی سے پونا کے لیے روانہ ہو گئے۔ ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں میں یہ بات زیر بحث رہی کہ آئندہ پالیسی کیا ہو اکثر کا خیال یہ تھا کہ اب تعمیری کاموں میں لگ جانا چاہیئے اس لیے کہ سیاسی تگ و دو سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ گاندھی جی اس خیال کے ہمنوا تھے لیکن مولانا کا کہنا تھا کہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت آچکی ہے اس لیے اسے موقع دیا جائے اور کوئی تحریک نہ شروع کی جائے بلکہ انتخابات میں حصہ لینا چاہیئے۔ آخر غور و خوض کے بعد مولانا آزاد کی بات مان لی گئی۔

اختتامِ جنگ پر انتخاب کا اعلان ہوا۔ مولانا کو جیسے ہی اس کا علم ہوا انھوں نے طے کیا کہ قیدیوں کی رہائی کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے قیدیوں کی عام رہائی کے سلسلے میں لارڈ ویول کو لکھا اور بتایا کہ خوشگوار فضا پیدا کرنے کے لیے قیدیوں کی رہائی ضروری ہے رہائی کی تجویز مان لی گئی بہت سے قیدی رہا کیے گئے۔ لیکن کچھ قیدی روک لیے گئے۔

ستمبر ۱۹۴۵ء میں جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی

میں ختم ہوا تو مولانا آزاد نے لارڈ ویول کو پھر خط لکھا کہ جو چند قیدی اب تک رہا نہیں کیے گئے ہیں انھیں بھی رہا کر دیا جائے، اس کا ملک پر اچھا اثر پڑے گا۔ چنانچہ لارڈ ویول نے باقی تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔

چونکہ برطانیہ میں لیبر پارٹی انتخابات میں کامیاب ہو چکی تھی اور اسی نے حکومت بنائی تھی اس لیے امید کی جارہی تھی کہ اب کچھ نہ کچھ ہندوستان کے معاملہ میں کیا جائے گا اور صحیح قدم اٹھایا جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ اس نے ایک پارلیمنٹری ڈیلیگیشن ۱۹۴۵ – ۱۹۴۶ء کی درمیانی سردیوں میں ہندوستان بھیجا۔ مولانا آزاد کی ملاقات جب اس کے ممبروں سے ہوئی تو مولانا نے محسوس کیا کہ ڈیلیگیشن کے افراد کو ہندوستان کے مزاج میں جو کچھ تبدیلی آئی ہے اس کا احساس ہوگیا ہے اور انھیں اس کا بھی یقین ہوگیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی اب دیر تک روکی نہیں جاسکتی چنانچہ ان کی رپورٹ سے لیبر کیبینیٹ کے اس خیال کو تقویت پہنچی کہ جس قدر جلد ممکن ہو ہندوستان سے دوستانہ سمجھوتا کر لینا چاہیے۔

۱۷ر فروری ۱۹۴۶ء کو لارڈ پیتھک لارنس نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ایک کیبینیٹ مشن ہندوستان بھیج رہی ہے جو یہاں کی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں سے ملاقات کرے گا۔ اور آزادی سے متعلق تبادلہ خیال کرے گا۔

یہ مشن لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفرڈ کرپس اور اے وی الکزنڈر پر مشتمل تھا۔ ۱۵ر مارچ ۱۹۴۶ء کو مسٹر اٹیلی نے دارالعوام میں ہندوستان کے متعلق بیان دیتے ہوئے کہا کہ اب حالات بدل گئے ہیں اس لیے

سارے معاملے پر سرے سے غور و خوص کرنا چاہیئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۶ء کو کیبنیٹ مشن ہندوستان پہنچا۔ مولانا آزاد اس وقت کلکتہ میں تشریف رکھتے تھے۔ ۲ اپریل کو وہ کرپس سے ملنے دہلی آئے مولانا آزاد کے نزدیک اس وقت سب سے اہم مسئلہ ہندوستان اور برطانیہ کا سیاسی اختلاف نہیں تھا۔ بلکہ یہاں کا فرقہ وارانہ مسئلہ تھا' ان کی رائے تھی کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں زبان، تہذیب اور جغرافیائی حالات کا مختلف حصوں میں نمایاں فرق ہے وفاقی طرز حکومت ہی مناسب ہوسکتا ہے جس میں اقلیتوں کے مسائل بھی حل ہوسکتے ہیں۔

مولانا کی پہلی ملاقات کیبنیٹ مشن کے ممبروں سے ۱۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو ہوئی اس ملاقات میں مولانا سے مختلف سوالات کیے گئے اور اُن کی تجاویز پر غور و خوص کیا گیا۔

۱۲ اپریل ۱۹۴۶ء کو ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں مولانا نے اپنی کیبنیٹ مشن کی گفتگو کی تفصیل بتائی جس پر بحث و مباحثہ اور سوال و جواب کے بعد ورکنگ کمیٹی کو مولانا کی تجاویز مناسب معلوم ہوئیں۔ گاندھی جی نے بھی اتفاق کیا اور حل ڈھونڈھ نکالنے پر مبارکباد دی۔

کیبنیٹ مشن کے ارکان سے مولانا کی گفتگو اپریل کے آخری دنوں تک ہوتی رہی اور مشن کے ارکان آپس میں بھی تبادلہ خیال کرتے رہے اس درمیان ہی میں مشن کشمیر کے لیے روانہ ہوگیا' جہاں سے ۲۴ اپریل کو دہلی واپس آیا اور وائسرائے سے ملاقات کے بعد دستور سے متعلق حسب گفتگو نظر ثانی کی۔

۲۷ اپریل کو مشن نے بیان دیا کہ بڑی پارٹیوں کے درمیان باہمی

رضامندی سے معاہدہ کرنے کے بعد گفتگو مناسب ہوگی اس لیے مشن نے کانگریس اور لیگ کے صدر کو دعوت دی کہ وہ اپنی پارٹیوں کی ورکنگ کمیٹی کے نمائندے شملہ میں گفتگو کے لیے نامزد کریں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے نمائندہ چننے کی ذمہ داری مولانا آزاد کے سپرد کی۔ چنانچہ مولانا آزاد نے سردار پٹیل اور جواہر لال نہرو کو نمائندہ کی حیثیت سے انتخاب کیا۔ شملہ میں ان کے قیام کا انتظام حکومت نے کیا۔ گاندھی جی کا نام ان لوگوں میں نہیں تھا، باضابطہ طور سے گفتگو کرنے والے تھے، لیکن کیبنیٹ مشن نے انھیں شملہ آنے کی دعوت دی تاکہ ان کو حسب ضرورت مشورے میں شریک کیا جاسکے۔ گاندھی جی نے دعوت قبول کی اور شملہ پہنچ کر مینو رولا (Manor Villa) میں قیام کیا۔ مولانا آزاد ورکنگ کمیٹی کے غیر رسمی جلسے کرتے رہے تاکہ گاندھی جی شریک ہوتے رہیں اور تبادلہ خیال ہوتا رہے۔

۲ مئی ۱۹۴۶ء کو شملہ میں تبادلہ خیال ہوا جو ۱۲ مئی تک جاری رہا۔ تقریباً ۲ ہفتہ بعد مولانا دہلی واپس آئے، مشن کے لوگوں نے تجاویز مرتب کیں جن کا اعلان ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو دارالعوام House of Common میں کیا گیا۔

کیبنیٹ مشن اسکیم جو ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو شایع ہوئی تھی وہی تھی جس کا خاکہ مولانا آزاد نے ۱۵ اپریل کو پیش کیا تھا جس کے مطابق تین محکمے دفاع، امور خارجہ اور رسل و رسائل جنھیں مولانا نے اسکیم میں رکھا تھا لازمی طور پر مرکز کے ماتحت رکھے گئے تھے لیکن مشن نے ایک تجویز کا اضافہ کیا تھا۔ جس کی رو سے ملک کو تین حصوں اے۔ بی۔ سی میں تقسیم

کیا گیا تھا۔

حصہ "بی" میں پنجاب، سندھ، سرحد اور برطانوی بلوچستان شامل تھے جو مسلم اکثریت کے صوبے تھے۔ حصہ "سی" میں بنگال اور آسام کے صوبے شامل تھے ان صوبوں میں مسلمان دوسرے کے مقابلہ میں کچھ ہی زیادہ تھے۔ یہ حصّے اس لحاظ سے کیے گئے تھے کہ اقلیت مطمئن ہو سکے[۹۷]

چنانچہ کانگریس ورکنگ کمیٹی اور مسلم لیگ دونوں نے مشن کو منظور کر لیا۔

مولانا آزاد گذشتہ سات سال سے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ لارڈ ویول سے انھوں نے ہی گفتگو کی تھی۔ اور شملہ کانفرنس اور کیبنیٹ مشن سے ان ہی کا تعلق رہا تھا۔ اس لیے لوگوں کی رائے تھی کہ ایک سال کے لیے انھیں مزید صدر انتخاب کر لیا جائے لیکن مولانا آزاد راضی نہیں ہوئے اور اس جگہ کے لیے جواہر لال کا نام ۲۶ اپریل ۱۹۴۶ء کو تجویز کیا جو منظور ہوا۔

یہ کہتا چلوں کہ اسی ۱۹۴۶ء کے ماہ مئی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور و معروف تصنیف "غبار خاطر" آفتاب عالم پریس لاہور سے شایع ہوئی جس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈیڑھ دو مہینے میں پہلا اڈیشن ختم ہو گیا چنانچہ دوسرا اڈیشن اگست ۱۹۴۶ء میں شایع کرنا پڑا۔

---

[۹۷] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۳۰۲

اب ۷ر جولائی ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بلایا گیا۔ ۶ر جولائی کو آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لیے تجویزیں تیار کی گئیں۔

جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا تو مولانا نے جواہر لال نہرو سے صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے لیے کہا، سردار پٹیل نے شکریہ ادا کرتے ہوئے صدارت کے دوران میں مولانا آزاد کی اہم خدمات کا اعتراف کیا۔ مولانا نے کیبنیٹ مشن پلان کے متعلق تجویزیں پیش کیں اور اختصار کے ساتھ اس کی اہم باتوں کا ذکر کیا، اور بتایا کہ کیبنیٹ مشن پلان میں کانگریس کے تمام اہم اصولوں کو مان لیا گیا ہے چنانچہ بھاری اکثریت سے رزولیوشن منظور کیا گیا۔ لیکن خراب بات یہ ہوئی کہ ۱۰ر جولائی ۱۹۴۶ء کو جواہرلال نہرو نے ایک پریس کانفرنس میں کہہ دیا کہ کانگریس "کیبنیٹ مشن پلان میں تبدیلی اور کمی بیشی کرنے کی مجاز سمجھتی ہے [۹۸]"، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۷ر جولائی ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں کاؤنسل کے اجلاس میں مسلم لیگ نے اس بیان کی آڑ لے کر کیبنیٹ پلان کو مسترد کر دیا اور پاکستان کا مطالبہ دھرایا اور اعلان کیا کہ اسے حاصل کرنے کے لیے ڈائرکٹ ایکشن کی پالیسی پر عمل کیا جائے گا۔ مولانا آزاد اس نئی صورت حال سے بےحد پریشان ہوئے چنانچہ ۸ر اگست ۱۹۴۶ء کے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں انھوں نے کہا:

"۔۔۔۔ اگر ہم صورتِ حال کو بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں

---

۹۸ ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۱۴۳

تو ہمیں یہ بات صاف کر دینا چاہیئے کہ کانگریس کی رائے
آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رزو یوشن میں ظاہر کر دی گئی
ہے اور کوئی شخص چاہے وہ کانگریس کا صدر ہی کیوں نہ ہو
اس کو بدلنے کا مجاز نہیں ہے۹۹،،

جس جلسہ میں تجویز منظور ہوئی اس میں پریس کانفرنس کی کوئی بات نہیں کی گئی، صرف آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے فیصلہ کی توثیق کی گئی اور امید کی گئی کہ معاملہ اب نہیں بگڑے گا، لیکن کانگریس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

ادھر ورکنگ کمیٹی کی طرف سے کیبنیٹ مشن پلان کی منظوری کے جواب میں وائسرائے نے ۱۲ اگست کو پنڈت نہرو کو انٹیرم گورنمنٹ بنانے کی دعوت دی۔ لیکن محمد علی جناح نے پنڈت نہرو کی عارضی حکومت میں شرکت سے انکار کر دیا۔

حکومت برطانیہ نے عارضی حکومت بنانے کی ذمہ داری کانگریس کے سپرد کی تھی، چنانچہ مولانا آزاد، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور راجندر پرشاد ۱۷ اگست کو دہلی میں جمع ہوئے، گاندھی جی اور بعض دوسرے رہنماؤں کا خیال تھا کہ اس عارضی حکومت میں مولانا آزاد بھی شامل ہوں، لیکن مولانا نے نہایت غور و فکر کے بعد اپنے آپ کو اس سے الگ رکھنے میں بہتری سمجھی۔

حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ لارڈ ویول نے محسوس کیا کہ اس

---

۹۹ ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد مترجمہ محمد مجیب ص ۳۱۶

عارضی حکومت میں مسلم لیگ کو شامل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انھوں نے محمد علی جناح کو دہلی بلایا۔ دونوں کے درمیان کئی ملاقاتیں ہوئیں آخرکار ۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ نے عارضی حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

لیگ کو محکمہ مالیات دیا گیا جس کے لیے مولانا آزاد تیار نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کی اہمیت پر توجہ بھی دلائی اور بتایا کہ اگر یہ شعبہ مسلم لیگ کو دے دیا گیا تو بعد میں پریشانی اٹھانی پڑے گی اور یہ بات صحیح ثابت ہوئی۔

۱۱ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو مجلس دستور ساز کی پہلی نشست ہوئی صدارت کے لیے جواہر لال اور ولبھ بھائی پٹیل نے مولانا آزاد کا نام پیش کیا اور پُرزور طریقہ سے ان سے اس عہدے کو قبول کرنے کے لیے کہا۔ لیکن مولانا آزاد تیار نہیں ہوئے تو ڈاکٹر راجندر پرشاد کو صدر بنایا گیا[۳۰]

عارضی حکومت میں مولانا نے پہلے شمولیت سے انکار کیا تھا لیکن اب گاندھی جی بضد تھے کہ وہ وزارت میں شامل ہوں چنانچہ مولانا نے ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء کو محکمہ تعلیم کی ذمہ داری سنبھالی۔

اِدھر حکومت برطانیہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد اقتدار منتقل کرنے کا کام شروع کر دیا جائے لیکن لارڈ ویول ابھی اس کے خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ ناکام ہوئے

---

[۳۰] ہماری آزادی: ابوالکلام: مترجمہ محمد مجیب ص ۳۵۱

تو مستعفی ہو کر واپس چلے گئے۔ مولانا آزاد لارڈ ویول کے اخلاق کی وجہ سے انھیں بہت پسند کرتے تھے۔ اس لیے انھیں ان کے جانے پر افسوس ہوا۔

لارڈ ویول کے جانے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بٹن گورنر جنرل بنائے گئے۔ ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے ان سے کہا گیا تھا کہ وہ ۳۰؍ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے اقتدار منتقل کریں۔

لارڈ ماؤنٹ بٹن ۲۲؍ مارچ ۱۹۴۷ء کو ہندوستان پہنچے اور ۲۴؍ مارچ کو وائسرائے اور گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ اس کے بعد جلد ہی ان کی مولانا آزاد سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ برطانوی حکومت جلد سے جلد اقتدار منتقل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

ادھر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ایگزیکیٹو کاؤنسل میں بےاعتمادی اور بے اطمنانی کی وجہ سے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے اس لیے لارڈ ماؤنٹ بٹن کو رفتہ رفتہ تقسیم ہند کے لیے فضا ہموار کرنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے ان حالات میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی تو سردار ولبھ بھائی پٹیل کو راضی پایا۔ پھر انھوں نے جواہر لال کو جو تقسیم کی بات سننا پسند نہیں کرتے تھے ہم خیال بنانے کی کوشش کی جس میں انھوں نے بہت حد تک کامیابی حاصل کی۔

مولانا آزاد کو جب تقسیم کی بات معلوم ہوئی اور انھیں اس کا بھی علم ہوا کہ سردار پٹیل اور جواہرلال کو ماؤنٹ بٹن نے اپنا ہم خیال بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے تو وہ بہت مضطرب ہوئے۔ جب مولانا آزاد گاندھی جی سے ملے تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ گاندھی جی جو تقسیم کا

نام سننا پسند نہیں کرتے تھے اب تقسیم کے بارے میں سوچنے لگے ہیں، ایسی حالت میں مولانا آزاد لارڈ ماؤنٹ بٹن سے ملے اور اُن سے خواہش ظاہر کی کہ اپنی کارروائی دو سال کے لیے روک دیں۔ انھوں نے صحیح حالات سے حکومت برطانیہ کو آگاہ کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مولانا آزاد کو اس بات کا یقین تھا کہ حکومت برطانیہ کیبنیٹ مشن پلان کو آسانی سے نامنظور ہونے نہیں دے گی۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے لندن پہنچنے کے دو دن بعد ہی ان کی تقسیم ہند کی اسکیم منظور کرلی گئی۔

۳۰ مئی کو ماؤنٹ بیٹن دلّی واپس آئے۔ ۲ جون کو انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کو بلایا اور بات چیت کی۔ ۳ جون کو وہائٹ پیپر جس میں ان کے پلان کی پوری وضاحت تھی منظرِ عام پر آیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان تقسیم ہوگیا۔

نئے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ۳ جون کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا، جس میں سب سے پہلے اس بات پر غور کیا گیا کہ شمال مغرب صوبہ سرحد کا کیا ہوگا۔

پھر چودہ جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا، تقسیم ہند کے سلسلے میں پنڈت گووند ولبھ پنت نے تقریر کی، جس کی تائید میں سردار پٹیل اور جواہرلال نے تقریریں کیں۔ مولانا آزاد نے اپنی تقریر میں کہا:

"..... ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ واقعات کے ایک بہت ہی

لئلہ ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۲۸۷

افسوسناک سلسلہ کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان کا تقسیم ہو جانا،
ایک جان کاہ حادثہ ہے اور ہم اپنی معذرت کے لیے زیادہ
سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس سے بچنے کی امکانی
کوشش کی لیکن ناکام رہے ۔۔۔۔ اس لیے ملک کو
تقسیم کر رہے ہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہم نے
شکست کھائی ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں اس کی کوشش
کرنی چاہیئے کہ ہماری معاشرت اور تہذیب تقسیم نہ ہونے
پائے ۱۵؎"

آخر ۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارا ملک تقسیم ہو گیا اور ۱۵؍ اگست
کو ہندوستان بھی آزاد ملکوں کی صف میں آ کھڑا ہوا سارے
ہندوستانی اس خوشی سے جھوم اٹھے کہ اب وہ بھی آزادی کی نعمتوں
سے فیضیاب ہوں گے۔ اُردو کے شعراء نے "جشن آزادی" کی مسرتوں
کا اظہار اپنے شعر و نغمہ کو فضا میں بکھیر کر کیا

آزادی کی پہلی سالگرہ پر مولانا نے ہندوستانیوں کو ان کے فرائض
سے اس طرح آگاہ کیا:

" آزادی ہم نے حاصل کر لی ہے۔ لیکن آزادی کا
صحیح طور پر کام میں لانا ابھی باقی ہے۔ ہمارا
فرض ہے کہ اپنی ساری قوتیں اس دوسرے

۱۵؎ ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد: مترجمہ محمد مجیب ص ۳۹۵

کام کے لیے وقف کردیں۔ امن، اتحاد، باہمی اعتماد اور حب الوطنی کے بغیر یہ مہم سر نہیں کی جا سکتی۔"[۱۰۳]

---

۱۰۳ مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری ص ۳۰۴

ابھی ہندوستان کے عوام آزادی کی نعمت پاکر، پوری طرح اپنی خوشی کا اظہار بھی نہ کر پائے تھے کہ فرقہ پرستی نے سر اٹھایا، جس نے فضا میں منافرت گھول دی، اور فسادیوں کو "رقصِ ابلیس" کی ادا سکھادی۔ پھر کیا تھا، انسان قتل ہونے لگے، انسان زخمی ہونے لگے، انسان کچلے جانے لگے، انسان لٹنے لگے، انسان کی عزت خطرے میں پڑگئی، انسان کی عظمت لٹنے لگی، انسان، انسان نہ رہا، انسانیت کے نام پر بدنما داغ بن گیا۔ پہلے پنجاب کی سرزمین، پھر

دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

اس کی گلیاں، اس کے کوچے، اس کی فضائیں، اس کی ہوائیں، انسانی نالوں، انسانی آہوں اور انسانی سسکیوں سے معمور ہوگئیں، پھر تو نفرت اور انتقام کی ایسی ہوا چلی، ایسی فضا بنی کہ ہندوستان اُداس ہوگیا اور محبّت کی بوند کو ترسنے لگا۔

اِن حالات سے گاندھی جی بے حد مضطرب اور رنجیدہ خاطر ہوئے اور ان سے ہر قیمت پر نپٹنے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن جب کچھ نہ بن پڑا تو انھوں نے اس وقت تک کے لیے برت رکھنے کا اعلان کر دیا، جب تک

امن قائم نہ ہو جائے لوگوں کو جب اس کی خبر پہنچی تو انھوں نے بہت کوشش کی کہ گاندھی جی برت نہ رکھیں۔ ان کوشش کرنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل تھے، لیکن گاندھی جی نہیں مانے اور ۱۲ اگست سے انھوں نے برت رکھنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے ان کے تمام عقیدت مند پریشان ہو گئے اور انھیں برت توڑنے پر مجبور کرنے لگے۔ مولانا آزاد پیش پیش تھے۔ بڑی مشکل سے وہ نرم پڑے اور چند ایسے شرائط پر جن سے امن قائم ہو جانے کا یقین تھا برت توڑنے پر تیار ہو گئے مولانا آزاد بیان کرتے ہیں:

"اس کے بعد گاندھی جی کے اشارے پر ان کے حلقے کی عورتوں نے رام دھن شروع کی، ان کی پر پوتی ایک گلاس میں سنگترے کا رس لائی گاندھی جی نے اشارہ کیا کہ وہ گلاس مجھے دے دے۔ میں نے گلاس لے کر گاندھی جی کے ہونٹوں سے لگایا اور انھوں نے برت توڑ دیا[۱۳۶]"

پھر تو ہزاروں لوگ حسب وعدہ امن قائم کرنے میں مصروف ہو گئے اور وہ کامیاب ہوئے ادھر امن قائم ہونے لگا اُدھر مولانا آزاد بحیثیت وزیر تعلیم اپنے فرائض کو انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔ مذہبی تعلیم کی اہمیت مولانا آزاد کی نظر میں ہمیشہ سے رہی تھی وہ اس کا مقصد انسان دوستی، وسیع القلبی، بے تعصبی اور محبت و اخوت کو سمجھتے تھے،

---

[۱۳۶] ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد مترجمہ محمد مجیب ص ۲۴۰۔

چنانچہ ۱۳ر جنوری[۱] ۱۹۴۸ء کو سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے مذہبی تعلیم پر زور دیا تھا' پھر ۱۶ر جنوری کو قومی تعلیم کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے بتایا تھا کہ علم کی دنیا میں تنگ و محدود حب الوطنی بے معنی ہے۔

پھر ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کی غمناک تاریخ آئی — گاندھی جی کو ایک دیوانے نے اس وقت اپنی گولی کا نشانہ بنایا' جب وہ پرارتھنا میں شریک ہونے کے لیے باہر تشریف لائے تھے اور گاندھی جی ہمارے محبوب رہنما اور ہندوستان کے عظیم معمار ہم سب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ اس خبر نے سارے ہندوستان کو فورغم سے نڈھال کر دیا۔ سبھوں نے محسوس کیا کہ ان سے باپو کی صورت میں ایک ایسی محبت کرنے والی شخصیت' شفقت برتنے والی ہستی چھین لی گئی جس کا بدل ممکن نہیں اردو کے مشہور و معروف شاعر اسرار الحق مجاز نے کہا:

دردو غم حیات کا درماں چلا گیا
وہ خضر عصر و عیسیٰ دوراں چلا گیا
ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا
برہم ہے زلف کفر تو ایماں ہے سرنگوں
وہ فخر کفر و نازش ایماں چلا گیا

---

[۱] مولانا ابوالکلام آزاد نمبر: صبح دہلی ص ۱۰۸

بیمارِ زندگی کی کرے کون دل دہی
نبّاض و چارہ ساز مریضاں چلا گیا

۱۹۴۸ء کے شاید اپریل یا مئی میں مولانا آزاد کو دارالمصنفین اعظم گڑھ کی مالی حالت خراب ہو جانے کی وجہ سے توجہ دلائی گئی۔ اس سلسلے میں جب مولانا عبدالماجد دریا بادی نے انھیں خط لکھا تو مولانا نے تحریر کیا:

" ہر بات اپنے مناسب وقت میں ہوتی ہے "[1]

اور واقعی مولانا نے بہت جلد ساٹھ ہزار روپے کی خطیر رقم سے اس ادارے کی امداد فرمائی بلاشبہ یہ ادارہ جس نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے' اس کا مستحق تھا۔

مولانا آزاد کے زمانہ وزارت میں ایک بڑا کام یہ ہوا کہ ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن اور جس کے ممبروں میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے۔

۲۹ جنوری ۱۹۴۹ء کو جادوپور انجینئرنگ کالج کے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا:

" آزاد ہندوستان میں 'فنی' تعلیم کی بڑی اہمیت ہے اس لیے ہندوستان کی حکومت کو چاہیئے کہ ایسی تعلیم کے لیے امداد دے اور ہر طرح سہولتیں فراہم کرے "

---

[1] تبرکات آزاد: مرتبہ غلام رسول مہر صفحہ ۹۲

اور کل ہند فنون لطیفہ کانفرنس منعقدہ ۱۹؍اگست ۱۹۴۹ء کے افتتاحی خطبہ میں مولانا آزاد نے کہا:

"ایک سماج کی صحتمندی اور اعتدال پسندی کا اظہار اس کے افراد میں ذوق لطیف کی ترویج سے ہوا کرتا ہے۔"[۱۵۸]

۲۶؍جنوری ۱۹۵۰ء کو جب ہندوستان آئین کی رو سے خود مختار جمہوریہ بنا اور ڈاکٹر راجندر پرشاد اس کے صدر اور جواہر لال اس کے وزیر اعظم بنے تو مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے وزارت تعلیم کا قلمدان ہوا۔

۸؍مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا ابوالکلام آزاد مجلس اقوام کی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے پیرس جاتے ہوئے لندن پہنچے۔ وہاں عجائب گھر میں مغل آرٹ کے نمونے دیکھے اور انڈیا آفس لائبریری میں پرانی قلمی کتابوں کے نسخوں اور مجموعوں کا معائنہ کیا۔ مولانا آزاد کا زیادہ وقت انڈیا آفس لائبریری کے ذخیرے کے دیکھنے میں صرف ہوا۔ مولانا نے ایک بیان میں کہا کہ قلمی مسودوں کا ایک حصہ ہندوستان لینا پسند کرے گا۔ برد فی صحافیوں کو انھوں نے بتایا کہ مرکزی حکومت نے ریاستی حکومتوں سے مشورہ کے بعد طے کیا ہے کہ ابتدائی تعلیم مقامی مادری زبان میں دی جائے گی' مولانا کی طبیعت اچانک خراب ہوجانے کی وجہ سے انھیں ایک ہفتہ مزید قیام کرنا پڑا۔

اگست ۱۹۵۱ء میں حکومت بنگال سے کلکتہ سے قریب ہگلی کے مقام پر ایک ہزار ایکڑ زمین مشرقی ہائر ٹیکنولوجیکل انسٹیٹیوٹ کے لیے

---

[۱۵۸] مولانا ابوالکلام آزاد نمبر صبح دہلی ص ۱۱۰

حاصل کی۔ یہاں آزادی سے پہلے کلکٹر کا بنگلہ تھا اور کچھ رہائشی مکانات تھے۔ جہاں سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے، لیکن آزادی کے بعد بہت جلد اس میں اساتذہ کے رہائشی مکان اور طلبہ کے لیے ہال بن گئے۔[۱۵۸]
مولانا چاہتے تھے کہ ٹکنیکل تعلیم کا انتظام ملک بھر میں مختلف مقامات پر کیا جائے۔ کھڑگپور انسٹیٹیوٹ آف ٹکنالوجی مولانا کی خواہش کا ہی نتیجہ ہے جس کی حیثیت آج ایک نہایت اہم ادارے کی ہے ۱۸ اگست ۱۹۵۱ء کو اس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا نے کہا تھا:

"میں نے عہدہ سنبھالتے ہی پہلے پہل یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہیں ٹکنیکل تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع اتنے اچھے بنا دینا چاہئیں کہ ہم اپنی ضرورتیں پوری کرسکیں۔ ہمارے نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے لیے غیر ملکوں کو جاتی ہے انھیں یہ ٹریننگ یہیں مل سکے جب ہم ٹکنیکل تربیت اس اونچے معیار کی دے سکیں گے تو باہر کے لوگ یہاں آئیں گے[۱۵۹]"

ٹکنیکل تعلیم کی ترقی اور پھیلاؤ کے ساتھ اعلیٰ سائنس کی تعلیم کے لیے بھی مولانا فکرمند تھے۔ چنانچہ اسی غرض سے انھوں نے ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی تاکہ سائنس سے دلچسپی رکھنے والے اچھے اور لائق افراد پر نظر رکھی جائے اور انھیں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

---

[۱۵۸] ابوالکلام آزاد: عرش ملسیانی ص ۹۷

[۱۵۹] ″ ″ ″ ص ۹۷

اس طرح سائنسی اور ٹکنیکل تعلیم کے لیے مولانا آزاد نے ایسی کوشش کی کہ آج سارے ہندوستان میں ان کے اہم ادارے نہایت بہتر طریقہ سے اپنا کام انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ انھیں اداروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج سائنسی اور ٹکنیکل تعلیم کے دور میں ہمارا ملک بہت سے دوسرے ملکوں سے آگے ہو گیا ہے۔

اس کے ساتھ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام بھی مولانا آزاد ہی کی فکر و توجہ کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے ساری یونیورسٹیوں میں تال میل قائم کرنے، نظامِ تعلیم کی بہتری میں اور تحقیقی کاموں کو فروغ دینے میں بڑی مدد ملی۔ جس کا اعتراف اہلِ نظر بار بار کرتے رہتے ہیں۔

مصوری، مجسمہ سازی، موسیقی اور ادب کی ترقی کے لیے مولانا نے تین اکیڈمیاں، سنگیت ناٹک اکیڈمی، للت کلا اکیڈمی، اور ساہتیہ اکیڈمی قائم کیں، جو اپنے اپنے طور پر مفید کام کر رہی ہیں۔

ساہتیہ اکیڈمی کا افتتاح ۱۲ر مارچ ۱۹۵۴ء کو ہوا، اس کے ذریعہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے کارناموں اور مصنفوں کا تعارف اور عظیم کارناموں پر انعامات تقسیم کر کے مصنفین کی ہمت افزائی مقصود ہے۔ مختلف زبانوں کے الگ الگ اہلِ علم کے بورڈ بنے ہوئے ہیں جو اپنی اپنی زبانوں کے مصنفین اور اہم تخلیقات یا تصنیفات پر نظر رکھتے ہیں۔

۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء کو دہلی کے پریڈ گراؤنڈ میں انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام عظیم الشان کل ہند اردو کانفرنس ہوئی جس کا افتتاح کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو نے اردو کی اہمیت اور قدر و قیمت پر روشنی ڈالی اور مخالفین اردو کو اردو دوستی کی دعوت دی۔

مولانا آزاد نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہندی کی برابری نہیں چاہتی لیکن وہ آئین کے تحت اپنا حق چاہتی ہے۔

انھوں نے پرزور الفاظ میں کہا کہ اردو کے حق کو حکومت مانے اور عوام کو بھی ماننا چاہئے۔

۱۹ فروری کی صبح کے وقت حسب معمول مولانا آزاد غسل خانہ گئے جہاں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان کی بیماری کی خبر دور دور تک پہنچ گئی اور اس نے مولانا کے قدردانوں اور شیدائیوں کو مضطرب کر دیا۔ مسلسل تین دن تک مولانا بے ہوش رہے۔ کبھی کبھی ہوش آجاتا تو قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کو پہچان جاتے۔ اتفاق سے ایک بار پنڈت نہرو بیٹھے ہوئے تھے کہ ہوش آیا تو "خدا حافظ" کہا۔

دہلی کے بہترین معالج مولانا کا علاج کر رہے تھے۔ کلکتہ سے ڈاکٹر بی۔سی رائے بھی آگئے تھے۔ آخر ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو وقت آخر آپہنچا۔ سوا دو بجے شب میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور مولانا آزاد اس دارِ فانی سے آزاد ہو کر اپنے معبودِ حقیقی سے جاملے۔

دوپہر ایک بجے اسی ۲۲ فروری کو مولانا آزاد کا جنازہ اُٹھا۔ لاکھوں سوگوار، جنازہ کے ساتھ ساتھ تھے تقریباً دو لاکھ نفوس نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔ قلعہ معلّٰی اور جامع مسجد کے درمیانی وسیع میدان میں تیسرے پہر اپنے محبوب رہنما کا جسد خاکی سپرد خاک کر کے ان سے محبت کرنے والے، ان کے قدرداں، باحسرت و یاس، مغموم دلوں نمناک آنکھوں اور غمناک چہروں کے ساتھ رخصت ہوئے:

لٹی لٹی سی ہے ہر جنّتِ نگاہ کہ تو
تمام دلکشیِ کائنات لے کے گیا
خیال و فکر کی نزہت دل و جگر کا سکون
نظر کی تازگی لطفِ حیات لے کے گیا

فضا ابن فیضی

خدمات ———

- صحافتی
- سیاسی و مذہبی
- علمی و ادبی

مولانا ابوالکلام آزاد کی قلمی زندگی کا جو بیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصّہ میں پھیلی ہوئی ہے اگر جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس دوران میں اس قدر تحریری سرمایہ نہیں پیش کر سکے جن کی اُن جیسے صاحب قلم سے اس مدّت میں اُمید کی جا سکتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہوئی کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں داخل ہوتے ہی وہ ہندوستان کی سیاست میں پوری توجہ کے ساتھ عملی حصہ لینے لگے اور بہت جلد جنگِ آزادی کے نامور سپاہی بن گئے۔ انھوں نے اپنی بات سے اہل ہند کو آگاہ کرنے اور انھیں اپنا ہم خیال بنانے کے لیے "الہلال"، "البلاغ" اور "پیغام" جیسے ہفتہ وار جاری کیے اور اس طرح صحافتی زندگی اختیار کی اور اس میں اپنی پہچان واضح کی، لیکن اس کے ساتھ وہ کسی لمحہ مذہبی فرائض سے غافل نہیں رہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو قرآن کی روح سے باخبر رکھنے اور ان کی عملی زندگی میں اسے داخل کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ لیکن ہندوستانی سیاست کی ہماہمی نے، انھیں زیادہ لکھنے پڑھنے کے مواقع نہیں دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صحافتی زندگی ادھوری رہ گئی،

مذہبی خدمت بھی وہ نہیں کرسکے جس کی وہ خواہش رکھتے تھے، علمی ، ادبی خدمت بھی ان کے حصہ میں کم آئی، لیکن جو کچھ بھی علمی، ادبی، مذہبی اور صحافتی خدمات انجام دے سکے۔ بلاشبہ وہ آج بڑی اہم ہیں اور کل بھی اپنی اہمیت برقرار رکھیں گی۔

صحافتی زندگی

مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی زندگی کا اگر سرا تلاش کیا جائے تو وہ ان کی شعروشاعری کے ابتدائی ذوق سے جا ملتا ہے۔ انھوں نے شاعری اس وقت شروع کی تھی جب مضامین لکھنے اور عربی فارسی سے ترجمہ کرنے کی طرف مائل ہوچکے تھے اور ان کے رشحاتِ قلم رسائل و اخبارات میں چھپنے لگے تھے شعر کہنے اور گلدستوں میں کلام کی اشاعت نے ان کے دل میں خود گلدستہ نکالنے کا خیال ہی پیدا نہیں کیا بلکہ ادھر انیسویں صدی رختِ سفر باندھنے میں مصروف تھی ادھر مولانا آزاد ایک گلدستہ "نیرنگ عالم" کے نام سے نکالنے میں کامیاب ہوکر انیسویں صدی کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کر رہے تھے، لیکن مولانا آزاد جیسے عالی ہمت نوجوان کو اس گلدستہ کی اشاعت نے تسکین نہیں پہنچائی بلکہ تشنگی بڑھادی، چنانچہ ۱۹۰۰ء میں ایک ہفتہ وار رسالہ "المصباح" نکال کر اسی تحفہ کے ساتھ جانے والی صدی کو الوداع کہا۔ انیسویں صدی رخصت ہوئی، بیسویں صدی کے رخ سے پردہ ہٹا اور وہ جلوہ افروز ہوئی تو صحافتی زندگی نے مولانا کے قدم چومے اور رہنمائی کی۔ مولانا کے دل میں صحافتی زندگی اختیار کرنے کی خواہش کسی نہ کسی صورت میں تو پہلے ہی پیدا ہوچکی تھی اب تیز ہوگئی۔ اسی خواہش کی تیزی نے انھیں "خدنگ نظر" کے حصہ نثر کی

ترتیب کی ذمہ داری سنبھالنے پر مجبور کیا۔ ایڈورڈ گزٹ کی ادارت میں شمولیت کا سبب بھی یہی تھا لیکن ان کے جذبے کی تسکین نہیں ہوئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں ذاتی ماہنامہ نکالنے کی آرزو ایک بار پھر مچلنے لگی۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ بھی ہو کہ وہ دوسروں کی خواہش کا پابند رہ کر کسی رسالے میں کام کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے کہ وہ ادبی ذوق کو تسکین پہنچانے کی خواہش کے ساتھ ساتھ قومی و ملّی سطح پر ملک کی سیاسی و سماجی خدمت بھی کرنا چاہتے تھے اور مذہبی فرائض بھی ادا کرنا چاہتے تھے لیکن ان رسائل سے ان کے اس طرح کے جذبات کی تسکین ممکن نہ تھی، چنانچہ ۱۹۰۳ء کے نومبر میں "لسان الصدق" کی اشاعت اسی غرض کے پیش نظر ہوئی۔

مولانا آزاد نے کوشش کی کہ اس رسالہ میں علمی، ادبی، اخلاقی، سماجی، تاریخی اور سائنٹفک مضامین اس طرح کے شایع ہوں جن سے ذہن کی تعمیر ہو، نظر کو وسعت ملے اور فکر کو رفعت حاصل ہو، اس رسالہ کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس وقت پندرہ سال کے "ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی" کے دل میں قوم کے لیے کیسی تڑپ تھی اور ان کا ذہن "لسان الصدق" کے مقاصد کے سلسلہ میں کس حد تک صاف اور واضح تھا۔ لیکن بد قسمتی سے اس نے بھی زیادہ عمر نہیں پائی۔

"لسان الصدق" کے بعد مولانا کا الندوہ سے چھ ماہ کا تعلق رہا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزاد یہاں بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ ممکن ہے ان کے سیاسی، سماجی اور مذہبی خدمت کے جذبے کو اس معیاری رسالے سے تسکین نہیں ہو۔ جس کی وجہ سے مجبوراً اس سے علیحدہ ہو کر اپریل ۱۹۰۶ء میں وکیل امرتسر کی ادارت میں شامل ہو گئے۔ پھر جنوری ۱۹۰۷ء سے چھ ماہ دارالسلطنت

کلکتہ کے مدیر رہے لیکن اس کے مالک سے شاید نظریاتی اختلاف کی وجہ سے اسے چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ چند ماہ بعد ہفتہ وار وکیل امرتسر کے مالک کی خواہش اور کوشش سے ستمبر ۱۹۰۷ء سے دوبارہ وکیل میں کام کرنے لگے لیکن اس کے باوجود کہ یہاں سیاسی خدمت کے کچھ مواقع حاصل تھے اخبار کے مالک کی بے جا مداخلت سے تنگ آکر اس سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

ندوہ کے زمانہ قیام میں انھیں عربی کے چند معیاری رسائل "الہلال" "المنار" اور "اللوا" وغیرہ دیکھنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ مولانا آزاد ان رسائل کے معیار، مقاصد اور ترتیب و تزیئن سے بے حد متاثر تھے۔ اتفاق سے ۱۹۰۸ء کے اواخر میں ایک بار انھیں ترکی، مصر اور عراق وغیرہ کے سفر کا موقع ملا تو وہاں ان عربی جریدوں نے مولانا کے دل میں چھپے ہوئے مدیر کو بیدار کرنے اور متحرک ہونے کے لیے اسباب پیدا کیے۔ چنانچہ اس سفر سے واپسی کے بعد وہ اسی فکر میں ڈوبے رہے لیکن ظاہری و باطنی معیار جو انھوں نے اس کے لیے طے کر رکھا تھا اس پر غور و خوض کی ہر منزل میں قائم رہے جس کی وجہ سے انھیں رسالہ نکالنے میں تاخیر ہوئی۔ مولانا نے تاخیر کی تکلیف برداشت کی لیکن معیار سے کمتر پرچہ نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوئے تقریباً ڈیڑھ دو سال بعد ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو وہ ہفتہ وار "الہلال" ایک خاص وقار، معیار، شان اور نظریہ سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔

اس رسالہ میں اگرچہ ابتدا ہی سے "احرار اسلام"، "فسانہ عجم"، "مغرب اقصیٰ اور عالم اسلامی" وغیرہ مستقل عنوانات کے تحت اسلامی ممالک سے متعلق تحریریں زیادہ ہوتی تھیں، لیکن ان سے ہندستانی

مسلمانوں کو بیدار کرنے کا کام بھی لیا جارہا تھا، تاکہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں وہ انگریزوں کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں۔ بلاشبہ مولانا آزاد اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ اس رسالہ نے بہت قلیل مدت میں آزادی حاصل کرنے کے لیے ہندوستانیوں کو انگریزوں سے مقابلہ کے لیے آمادہ کردیا۔ ستمبر ۱۹۱۳ء کے شمارے کی ایک تحریر "مشہدِ اکبر"[۱۱۵] کی اشاعت پر دو ہزار روپے کی ضمانت طلبی اور ۱۹۱۴ء میں ضمانت کی ضبطی[۱۱۶] اور "الہلال" کی اشاعت کا بند ہونا اسی وطن کو آزاد کرانے کی خواہش کے نتائج تھے۔ "مشہد اکبر" کے ذیل کے اقتباس سے "الہلال کا مزاج اور مولانا آزاد کا اندازِ فکر ظاہر ہوتا ہے:

> "مجروحینِ کانپور! تم نے گولیاں کھائی ہیں، نیزوں سے تمھارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے تمھاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں۔ تمھارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہے۔ تمھیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا جس کے بعد بنو امیّہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا۔"
>
> معصوم بچّو اور ریاضِ اسلام کے نو دمیدہ غنچو! تمھیں کس نے مرجھایا؟ سر جیمس مسٹن کے الفاظ طعن نے تمھارے

---

[۱۱۵] الہلال کلکتہ: ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء

[۱۱۶] ۱۶ر نومبر ۱۹۱۴ء ــــ (۱۴ر اکتوبر و ۲۱ر اکتوبر کے مشترکہ شمارے میں "حدیث الجنود" اور "سقوط انٹروپ" کی اشاعت حکومت کے نزدیک قابل اعتراض سمجھی گئی)۔

بے گناہ و ناآشنائے جرم دلوں کو مضطرب کر دیا۔ تم بڑھے کہ
اپنے دہنِ زخم سے اس الزام کی تکذیب کرو۔ اے طائران
قدس اڑ جاؤ کہ عرش کی سبز قندیلیں تمھاری منتظر ہیں ۔"

اس کے ادبی حصّہ میں مرزا غالب کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت سے جہاں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو غالب سے کس قدر دلچسپی تھی ان کے ادبی ذوق اور معیار و مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے ان کی تحقیقی نظر اور تنقیدی بصیرت سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

"الہلال" کے بعد "البلاغ" کے شمارے منظر عام پر آئے۔ یہ ہفتہ وار بظاہر "الہلال" کا بدل تھا لیکن خالص "الہلال" کے مزاج کا نہ تھا اس میں سیاسی موضوعات کم ہوتے تھے، اسلامیات اور علمی موضوعات کا حصّہ اچھّا خاصہ ہوتا تھا لیکن ادبی اور تنقیدی مضامین کے لیے بھی جگہ رکھی گئی تھی۔

رانچی کی نظر بندی سے رہائی کے بعد جنوری ۱۹۲۰ء میں کلکتہ پہنچے تو چند روز بعد ایک بار پھر ایک ہفتہ وار کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ اپنے افکار و خیالات اور ملک کے سیاسی حالات سے اہل وطن کو آگاہ کر سکیں، چنانچہ ۲۳/ دسمبر ۱۹۲۱ء کو عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں ایک ہفتہ وار پیغام نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ اس رسالہ میں بظاہر مولانا کی حیثیت نگراں کی تھی لیکن حقیقت یہی ہے کہ سب کچھ وہی تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی سیاست میں بڑی گرمی پیدا ہو گئی تھی مولانا آزاد نہایت بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ اس سیاسی جنگ میں حصّہ لے رہے تھے۔ پیغام کا اجرا بھی اسی غرض سے ہوا تھا، چنانچہ پہلے شمارہ میں اس کی اشاعت کی غرض و غایت اس طرح واضح کی گئی تھی :

"اس رسالہ کی اشاعت سے بالفعل صرف یہ مقصود ہے کہ موجودہ تحریک کے لیے تبلیغ و ہدایت کا ایک باقاعدہ سلسلہ قائم ہو جائے پس اصل موضوع رسالے کا یہی ہے البتہ گاہ گاہ علمی و مذہبی مضامین کے لیے بھی گنجائش نکالی جائے گی، تفسیر قرآن کے بعض مناسب وقت مباحث اور حصے بھی شائع ہوتے رہیں گے"[۱۳]

اور اس میں شک نہیں کہ ان کے صفحات پر غالب حصہ سیاست کا رہا اور چونکہ مولانا آزاد سیاست میں زیادہ دخیل تھے اس لیے اس کی پوری جھلک پیغام کے صفحات میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اگرچہ یہ اخبار ہفتہ وار تھا لیکن اس کے ذریعہ قارئین کو بعض اہم سیاسی خبروں سے آگاہ کرنے اور مولانا آزاد کے سفروحضر سے باخبر رکھنے کی کوشش بھی کی جاتی تھی، بلاشبہ مجموعی حیثیت سے "پیغام" بھرپور سیاسی ہفتہ وار تھا، جس میں مولانا آزاد اپنے سیاسی خیالات و اعمال کے ساتھ پوری طرح جلوہ افروز تھے۔ اس ہفتہ وار کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں عام طور سے "الہلال" کے مقابلہ میں زبان نہایت سادہ اور عام فہم استعمال کی جاتی تھی جس سے اس وقت حصول مقصد میں یقیناً مدد ملتی ہوگی۔

"پیغام" کے بعد تقریباً ساڑھے پانچ سال مولانا آزاد کوئی ہفتہ وار جاری نہ کر سکے، اس دوران میں ابتدائی ایک سال تو انھوں نے جیل میں گزارا باقی ساڑھے چار ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں اپنے آپ کو مصروف رکھا۔

---

[۱۳] "پیغام"، ہفتہ وار کلکتہ جلد ۱ شمارہ ۱ صفحہ ۳ کالم ۲

۱۰ر جون ۱۹۲۷ء کو "الہلال" دورِ ثانی کا پہلا شمارہ شایع کر کے منظرِ عام پر لانے کا موقع ملا۔ لیکن الہلال دورِ ثانی کے مختلف شماروں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا آزاد اسے اتنا وقت نہ دے سکے جتنے کی اسے ضرورت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ الہلال دورِ ثانی چھ ماہ تک نہایت بے ترتیبی سے نکل کر ۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو بند ہو گیا۔ جہاں تک اس دور کے "الہلال" کے مقاصد کا تعلق ہے وہ حسب ذیل تھے:

۱ ملک کی موجودہ سیاسی زندگی کے عملی مسائل۔
۲ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا موجودہ ذہنی اور عملی انتشار جو پچھلی حرکت کے ردِ عمل (ری ایکشن) کی صورت میں نمایاں ہوا اور اس کے عملی مباحث۔
۳ مسلمانانِ ہند کی قومی و اجتماعی ذہنیت کی تشکیل اور اس کے اہم مباحث۔
۴ دینی اور علمی مباحث۔

لیکن عملی طور پر ابتدائی چند شماروں کو چھوڑ کر اس کے اوراق ہندوستان کی گرما گرم سیاسی بحثوں سے خالی رہے حالاں کہ خود مولانا آزاد اس دوران میں ہندوستانی سیاست کے محترم رہنما بن چکے تھے اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصّہ لے رہے تھے اگر مولانا آزاد کے صحافتی کارناموں کا جائزہ لیا جائے، تو اس میں الہلال دورِ اوّل کی سب سے زیادہ اہمیت محسوس ہوتی ہے اس لیے کہ اس دور کے عام صحافتی رنگ سے ہٹ کر اس کا اپنا خاص مزاج رہا، اس کے مسائل میں سنجیدگی، انسانی ہمدردی، سیاسی پختگی اور ایک اسلامی رنگ کا احساس ہوتا ہے، لیکن یہ اسلامی رنگ کسی تنگ نظری

آئینہ دار نہیں ہے بلکہ وسیع تر انسانی ہمدردیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اس کی زبان پرُوقار، پرُشکوہ، جاہ وجلال کی مظہر، خطابتی رنگ میں رنگی ہوئی، عربی فارسی کے الفاظ اور اصطلاحات سے سجی سجائی، لیکن بے لطف نہیں پُرکیف کہ پڑھتے جائیے اور ایک خاص کیفیت سے لذّت یاب ہوتے جائیے ایسی کیفیت جو اپنے پرُوقار وجود کا احساس دلاتی ہے۔

اس کے اسلوب کو سنجیدہ اور فکر انگیز بنانے میں قرآنی آیات نے بڑا کام کیا ہے مولانا ابوالکلام آزاد اُردو صحافت کی دنیا میں پہلے شخص ہیں جو قرآن کو روزمرّہ زندگی سے قریب لائے اور عام زندگی کو اس سے رہبری اور تابناکی حاصل کرنے کا موقع دیا۔ "الہلال" کے پہلے دور کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے صحافت کا جو کمزور پودا ۱۹۱۰ء میں "المصباح" کی صورت میں لگایا تھا وہ بارہ سال کی مدّت میں "الہلال" کی شکل میں تناور اور چھتنار درخت بن گیا۔ یہی مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کے عروج کا زمانہ تھا۔ کاش یہ عروج کا زمانہ طویل ہوتا تو اُردو صحافت آج اور زیادہ بلند مقام پر ہوتی، مولانا آزاد کی صحافتی زندگی اور خاص طور سے "الہلال کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ صحافت ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے لیکن سیاست نے ان سے صحافتی زندگی چھین لی۔

سیاسی اور مذہبی خدمات ـــــــ

مولانا ابوالکلام آزاد کی پوری زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ انھیں اسلام سے بے حد محبت تھی، سرسید کا احترام، شبلی سے وابستگی، ندوہ کی حمایت میں ان کے رسائل، قرآن کا ترجمہ وتفسیر، اسلامی ممالک سے دلچسپی حزب اللہ درس قرآن، دارالارشاد، نظم جماعت، الہلال، البلاغ کے اوراق، امارت شرعیہ کی بنیاد یہ سب ان کی اسلام سے گہری وابستگی کے ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اسلام سے اس گہرے تعلق نے انھیں تنگ دل نہیں بنایا بلکہ وسعت نظر عطا کی۔ حب الوطنی کے جذبے کو تیز کیا اور جنگ آزادی کی مختلف منزلوں میں بار بار مدد کی۔

اسلام کی خدمت کا جذبہ اور قومی وملی احساس پیدا کرنے میں گھر کے ماحول کے علاوہ مولانا شبلی سے تعلق نے مدد کی، انجمن حمایت اسلام اور ندوہ کے جلسوں میں شرکت، اکابر ملت سے تبادلۂ خیالات نے ان کے ذہن اور دماغ کی تربیت کی اور ان میں بات کہنے، سمجھنے اور سمجھانے کا طریقہ وسلیقہ آیا، قومی وملی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہوا اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی ہمت پیدا ہوئی اس طرح مستقبل کے کاموں کے لیے رہنمائی ملی۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں "آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ میں بڑے شوق سے شریک ہوئے۔ لیکن مولانا شبلی کی صحبتوں کا رفتہ رفتہ یہ اثر ہوا کہ ان میں قومی احساسات پیدا ہونے لگے۔ پھر "وکیل" امرتسر کے تعلق نے ان میں سیاست سے زیادہ دلچسپی پیدا کی کلکتہ کے قیام نے جہاں تقسیم بنگال کے خلاف زور تھا اور انقلابی جماعت کی سرگرمیاں شباب پر تھیں ان کے جذبات میں گرمی پیدا کی اور وطن کے لیے کچھ کر گزرنے کا عزم دیا۔ ۱۹۰۸ء کے بغداد، عراق اور ترکی کے سفر نے وہاں کے انقلابیوں سے ملنے اور تبادلہ خیال کا موقع فراہم کیا، جس نے انھیں بے حد متاثر کیا اور عزم و حوصلہ دیا۔ چنانچہ ہندوستان واپسی کے بعد وہ شیام سندر چکرورتی کی انقلابی جماعت سے راہ و رسم پیدا کرنے میں اور اس کے معتبر ممبر کی حیثیت اختیار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن جلد ہی وہ اس جماعت سے الگ ہو جاتے ہیں اور اپنے سیاسی راستے کا تعین کرتے ہیں اور کلکتہ سے ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو "الہلال" نکال کر اپنے سیاسی نظریے کی نشر و اشاعت اور اپنے مذہبی اعتقادات کی تبلیغ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

یہیں سے آزاد کی باضابطہ سیاسی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ جذبۂ حب الوطنی کو توانائی ملتی ہے اسلامیات کی اشاعت اور قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کو نئے انداز سے پیش کرنے میں الہلال کے اوراق مدد کرتے ہیں۔ "الہلال" کے بعد "البلاغ" جاری ہوتا ہے۔ اسی دوران میں تحریک "حزب اللہ" کا اعلان کرتے ہیں۔ دارالارشاد کی بنیاد ڈالتے ہیں اور زبان، قلم اور عمل سے ہندوستانیوں خاص طور سے

مسلمانوں میں انگریزوں کی غلامی کے خلاف جذبات بیدار کرنے اور آزادی کی نعمتوں سے انھیں باخبر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ان کے متعلق یہ سوچنے پر مجبور ہوئی:

"۔۔۔۔ یہ شخص ملک معظم کے دشمنوں سے ساز باز رکھتا ہے۔[۱۱۳]"

تو مولانا آزاد نے ایک خط کے ذریعہ وائسرائے کو نہایت پر زور الفاظ میں آگاہ کیا:

"۔۔۔۔ نہایت تفصیل سے اسلام کے احکام درج کر دیئے تھے جن کی رو سے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی برٹش گورنمنٹ کی نوکری کرے۔[۱۱۴]"

رانچی میں نظر بندی کے زمانے کو غنیمت جان کر قرآن کے ترجمہ اور تفسیر میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اسے تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ یہیں تذکرہ مکمل ہوتا ہے جس میں مولانا ابتدا ہی سے اپنے ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن سے ان کے مذہبی مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"پس بلاشبہ اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم یقین کرتا ہوں کہ مجھے ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس میں صدیوں سے سلسلۂ علم و ارشاد قائم و جاری ہے اور جس کے اسلاف کرام کے اعمال صالحہ کا پاک ورثہ یکے بعد دیگرے

---

۱۱۳ خطبات آزاد: مالک رام ص ۷۲،

۱۱۴ " " ص ۷۲،

اخلاف تک منتقل ہوتا آیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے اخلاف کو حق گوئی و حق پرستی اور طریق استقامت و عشق حق میں سرفروشی و جاں سپاری اور مغروران تاج و تخت و بندگان مال و جاہ کے مقابلے میں بے نیازی و سرگرانی ہمیشہ اپنے اسلاف کے ورثہ میں ملی ہے اسی کو اپنا موروثی خزانہ اور اسی کو اپنا خاندانی تخت و تاج سمجھتا ہوں [۱۱۵]"

یہی وہ زمانہ ہے جس میں ایک واقعہ سے مجبور ہو کر ایک اہم کتاب "جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد" قلم بند کی۔ جس سے ان کی وسعت نظر اور اسلام سے صحیح باخبری کا علم ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کے یہ سارے کام ان کے سیاسی شعور کو پختہ بنانے اور سیاسی راستے کو ہموار کرنے کی مختلف منزلیں ہیں۔

۱۸ر جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا آزاد کی گاندھی جی سے پہلی تاریخی ملاقات ہوتی ہے جو بعد میں ایک مضبوط رشتے میں اس لیے بدل جاتی ہے کہ دونوں کے سیاسی نظریات اور خیالات میں بہت کچھ یکسانیت تھی، مولانا آزاد حصول آزادی کی راہ میں اور آگے نکل جاتے ہیں جس سے ان کے ارادوں میں زیادہ پختگی اور حوصلوں میں بلندی پیدا ہوتی ہے، گاندھی جی بھی خلافت تحریک کے حامیوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس تحریک سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا

---

[۱۱۵] تذکرہ: ابوالکلام آزاد؛ مرتبہ مالک رام ص ۲۹

اور اسے قوت عطا کی۔ مولانا آزاد اس اتحاد کے لیے پیش پیش رہے انھوں نے اپنے خطبہ مجلس خلافت آگرہ ۲۵ / اگست ۱۹۲۱ء میں صاف صاف کہا :

" میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں، ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں یہ اعتقاد قرآن مجید کے نصِ قطعی پر مبنی تھا[۱۲۸] "

اسی اتحاد کے متعلق انھوں نے اپنی وہ بات بھی دہرائی جو " الہلال " کے پہلے نمبر میں کہی تھی :

" ۔۔۔۔ ہندستان کے سات کروڑ مسلمان ہندستان کے بائیس۲۲ کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہوجائیں کہ دونوں مل کر ہندستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں[۱۲۹] "

اور مجلس خلافت کے خطبہ افتتاحیہ میں ۲۶ / اگست ۱۹۲۱ء کو انگریزوں کو مخاطب کر کے نہایت پُرزور الفاظ میں کہا تھا :

" ہاں ہاں میں نے سپاہیوں سے ہندستان کی برٹش فوج سے یہ کہا ہے اور جب تک میرے حلق میں آواز پھنستی نہیں یہی کہتا رہوں گا، آج بھی اعلان کرتا ہوں

---

[۱۲۸] خطبات آزاد : مالک رام ص ۴۷

[۱۲۹] " " ص ۵۱

اور جب تک میری زندگی باقی ہے ہر صبح کو، ہر شام کو میرا فرض
یہی ہوگا کہ سپاہیوں کو ورغلاؤں اور ان سے کہوں کہ گورنمنٹ
کی نوکری چھوڑ دو[۱۱۸]"

مولانا آزاد ترک موالات کی نہایت سختی کے ساتھ تائید کرتے رہے چنانچہ ۱۹۲۱ء میں جب پرنس آف ویلز ہندوستان آرہے تھے انھوں نے نہایت بیباکی اور جرأت مندی کے ساتھ اعلان کیا:

پرنس آف ویلز کی آمد
ہندوستان کی خودداری اور اسلام کی محبت کی آزمائش
۱۷ر نومبر امتحان کا دن
جمیعۃ العلماء، مرکزِ خلافت کمیٹی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا
متفقہ فیصلہ ہے کہ اس سیاحت کو پوری طرح بائیکاٹ
کیا جائے
۱۷ر نومبر کو ہر جگہ کامل ہڑتال رہے[۱۱۹]

نومبر ۱۹۲۱ء کے جس سالانہ اجلاس میں جمیعۃ العلماء نے اپنے سابق فیصلہ ترک موالات کے حکم شرعی ہونے کی توثیق کی اس کی صدارت مولانا آزاد نے ہی کی تھی۔

ہندوستان کی جنگ آزادی کی لڑائی میں مولانا کی سرگرمی اور بے باکی رنگ لائی چنانچہ جلد ہی ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ مولانا آزاد

---

[۱۱۸] خطبات آزاد: مالک رام ص ۸۴
[۱۱۹] ہفتہ دار پیغام کلکتہ ۱۴ر نومبر ۱۹۲۱ء سرورق دیکھئے سے ۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء

کا تاریخی بیان "قولِ فیصل" جس کی بڑی شہرت ہوئی اسی گرفتاری سے متعلق ہے۔ جس نے مولانا آزاد کے سیاسی کردار کو اور زیادہ نمایاں کردیا اب وہ اور زیادہ اسلام کے شیدائی اور جنگ آزادی کے جری سپاہی بن کر سامنے آئے انھوں نے اس بیان میں نہایت پُرزور الفاظ میں کہا تھا:

> "مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری طرف تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو، ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے وقت اس کا جج ہے وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری ہوگا۔ والحمد للہ اولاً و آخراً۔"[سه]

مولانا نے پکے اور سچے مسلمان بن کر نیشلزم کی جس شاہراہ کو اختیار کیا تھا اس کے ہر تاریک موڑ پر انھوں نے قرآن کریم سے روشنی حاصل کی اور نہایت یقین و اعتماد کے ساتھ آگے بڑھے اور تادمِ آخر اس پر بڑھتے رہے چلتے رہے۔

مارچ ۱۹۴۰ء کے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس رام گڑھ میں مولانا نے نہایت اعتماد کے ساتھ پُرزور الفاظ میں کہا تھا:

سه قولِ فیصل: ابوالکلام آزاد: چمن بک ڈپو دہلی ص ۱۲۱

"ہندستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہوگئی اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملان تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے، لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا، اسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندستان کی جگہ ایک نئے ہندستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالا مال تھی، ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کر دی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے ہم نے اسے اسلام کے ذخیرے کی

وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی، جس کی اسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچادیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب ——— اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوا رکھتا ہے جیسا دعوا ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔[۱۲۰]"

مولانا آزاد کے سیاسی قید فرنگ کا زمانہ تقریباً دس سال کا ہوتا ہے یہ مدت کسی طرح کم نہیں ہے لیکن وہ جب بھی قید فرنگ سے رہا ہوئے تو تازہ دم واپس آئے۔ نہ خوف وہراس، نہ پیشانی پر بل، نہ تھکن کے آثار بلکہ ہمیشہ باہمت، باحوصلہ نظر آئے۔

انھوں نے ہمیشہ اعتدال کا راستہ اختیار کیا، نہ کبھی Prochanger کے ہم خیال بنے نہ ہی Nochanger سے متعلق ہوئے۔ کانگریس کی

---

[۱۲۰] خطبات آزاد: مالک رام: ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ۱۹۷۴ء ص ۲۹۸

تمام محترم رہنماؤں اور جنگ آزادی کے شیدائیوں کا اعتماد مولانا آزاد کو حاصل رہا، یہاں تک ۱۹۳۹ء میں مولانا آزاد کو دوسری بار کانگریس کا صدر منتخب کر لیا گیا اور یہ صدارت کا زمانہ تقریباً سات سال یعنی جولائی ۱۹۴۶ء تک رہا۔

۱۹۴۵ء میں آخری بار قید فرنگ سے رہائی کے بعد شملہ کانفرنس، پارلمنٹری ڈیلیگیشن اور کیبنٹ مشن کی بات چیت میں سرگرم رہے، اور اپنی صائب رائے سے سبھی کو متاثر کیا اور اکثر اپنی بات کو منوانے میں کامیاب ہوئے پھر عارضی حکومت کے زمانے میں محکمہ تعلیم کی ذمہ داری سنبھالی اور جب لارڈ مونٹ بٹن کے ہاتھوں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان تقسیم ہوا تو بے حد رنجیدہ ہوئے اس لیے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کو تاخیر سے لینا پسند کرتے لیکن ملک کی تقسیم پر راضی نہیں تھے انھیں اس بات کی بھی تکلیف تھی کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ ہندوستان کے ہندو مسلم بھی تقسیم ہو گئے جس کے خلاف وہ ساری زندگی جنگ کرتے رہے تھے اور ہندوستانیوں کو بار بار اتحاد اور اتفاق کی طرف متوجہ کرتے رہے تھے، ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں ایک بار انھوں نے کہا تھا:

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اِس سے دست بردار نہ ہوں گا، کیوں کہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو

یہ ہندستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو
یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے[۱۳۱]

ادھر ملک کی تقسیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا کردی اُدھر فرقہ وارانہ فساد نے سر اٹھائے، ہندوستان کے بہت سے علاقے اس کی لپیٹ میں آگئے۔ خود دہلی بھی اس آگ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکی، دلّی کی تباہی سے مولانا آزاد بہت رنجیدہ خاطر تھے۔ مسلمانوں کے پاؤں مایوسی کے عالم میں اکھڑنے لگے تو مولانا آزاد اس بےکسی اور بےبسی کے عالم میں آگے بڑھے اور جہاں انھوں نے حکومت کی اس طرف توجہ دلائی مسلمانانِ ہند اور خاص طور سے مسلمانان دہلی کو ہمدردانہ سمجھانے اور ان میں ہمت و حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کی انھوں نے نہایت جذباتی انداز میں مسلمانان دلّی کو جامع مسجد دہلی میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

" میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی چیز ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے میرے لیے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے میں نے اس زمانے میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمھیں یہیں سے خطاب کیا تھا، جب تمھارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمنان تھا اور تمھارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد تھا۔ آج تمھارے چہروں کا

---

[۱۳۱] خطبات آزاد: مالک رام ص ۲۰۵

اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار
پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔
تمھیں یاد ہے میں نے تمھیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی
میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے میں نے
چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے میں نے کروٹ
لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس
کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں آج داغ جدائی دے گئی ہے
اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی
شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف
احتراز کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔
نتیجہ معلوم کہ آج اُن ہی خطروں نے تمھیں گھیر لیا ہے
جن کا اندیشہ تمھیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔[۱۲]

اور مولانا آزاد کی اس تقریر کا واقعی بہت اچھا ردعمل ہوا، مسلمانوں کی ٹوٹتی ہوئی ہمت سنبھل گئی، مایوسی دور ہونے لگی، ان کے حوصلے اور عزائم جاگ اٹھے اور ایک طبقہ کے سوچنے کا انداز بدلا۔ ان کے فیصلوں میں تبدیلی آئی ـــ مولانا آزاد ان سے یہی چاہتے تھے۔

آج ملک کا صالح ذہن محسوس کرتا ہے مولانا ابوالکلام آزاد ایک محترم مسلمان بھی تھے اور بڑے محب وطن اور قومی رہنما بھی تھے۔ ان کا سیاسی نظریہ ہندو مسلم اتحاد کا امین بھی رہا اور ہندوستان کی

---

[۱۲] خطبات آزاد: مالک رام ص ۳۳۷

جنگِ آزادی کی راہ کے لیے روشن چراغ کا کام بھی انجام دیتا رہا ہے اور آئندہ بھی ملک کی سالمیت اور ترقی کے لیے ان کے افکار و خیالات ان کے حوصلے و عزائم ان کا صبر و ضبط اور جنگِ آزادی کی منزلوں میں ان کے نقشِ قدم ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے اور مضبوط اور خوشحال ہندوستان بنانے میں معاون ثابت ہوتے رہیں گے۔

علمی اور ادبی خدمات

مولانا آزاد کی شاعری کا دور اور طالب علمی کا زمانہ ایک ہی ہے یعنی ۱۸۹۹ء سے جبکہ ان کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی انھوں نے شاعری شروع کی۔ پھر مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور گلدستوں میں بھی چھپنے لگے اور کچھ اور وسیع حلقوں میں جانے پہچانے گئے لیکن ۱۹۰۲ء و ۱۹۰۳ء کے آتے آتے انھوں نے اچانک چمنستانِ شاعری کو خیر باد کہا اور نثر کی طرف رجوع ہوئے اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس میدان میں قدم آگے بڑھاتے چلے گئے اور شاعری سے ایسے بے تعلق ہوئے کہ پھر پلٹ کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا یہاں تک کہ لوگ بھول گئے کہ وہ شاعر بھی تھے۔

نثری خدمات کی ابتدا ۱۹۰۱ء میں "المصباح" جاری کر کے کی، بعد میں ندوہ کی حمایت میں چھوٹے چھوٹے رسائل قلمبند کئے۔ ۱۹۰۲ء میں "اعلانِ حق" کی اشاعت ہوئی، جس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ کسی سنجیدہ اور تجربہ کار شخص کی تحریر ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے معزز مخالفین نے اپنے اشتہاروں میں اور رسالوں میں، اپنی مختلف تقریروں

میں چھاپنا کہنا شروع کر دیا کہ" مولانا اپنے کشف اور نجوم اور رمل پر اعتبار کرتے ہیں اور حکم روزہ اور عید اوسی حساب سے دیتے ہیں غالباً اس کہنے سے یہ غرض ملحوظ ہے کہ دور دراز کے علماء جو اصل واقعہ سے بے خبر ہیں مولانا سے بدگمان ہوجائیں اس لیے میرا ارادہ تھا کہ اس بارے میں ایک رسالہ شایع کیا جائے جس میں اول تو اس دھوکے کو رفع کیا جائے اور پھر جن امور میں اختلاف ہے اون پر بحث کرکے دودھ کا دودھ پانی کا پانی باطل کو حق سے جدا کیا جائے۔ مگر آج تک اوس کی نوبت نہ آئی، چونکہ گذشتہ سال مسجد ناخدا میں بالائے مدرسہ قبل العصر ایک عابد زاہد مولوی صاحب مکرم معظم سے اس بارے میں گفتگو ہوگئی ہے اور ضیق وقت کی وجہ سے میں اپنے دلائل پیش نہیں کرسکا، بدیں وجہ یہ مختصر رسالہ جامع تحریر کرکے انصاف کا امیدوار ہوتا ہوں"[۱۳۳]

اسی کے ساتھ مولانا آزاد کے مضامین احسن الاخبار، مخزن، تحفۂ احمدیہ ایڈورڈ گزٹ، خدنگ نظر وغیرہ مختلف رسائل میں شایع ہوتے رہے جس کی وجہ سے مولانا پڑھے لکھے حلقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، ماہنامہ" لسان الصدق" شایع ہوا تو مولانا کی فکر میں گہرائی اور قلم میں پختگی آچکی تھی، اب وہ محض لکھنے کے لیے نہیں لکھ رہے تھے بلکہ حصولِ

---

۱۳۳ تحریر سہ ماہی دہلی جلد ۲ نمبر ۳ ۱۹۶۸ء ص ۴

مقاصد کے لیے قلم اٹھا رہے تھے۔ اس دور کے مضامین میں انھوں نے نہایت سادہ زبان استعمال کی ہے۔ اس میں آزاد کے مختلف موضوعات سے متعلق مضامین کے ساتھ ساتھ، کتابوں پر تبصرے بھی شایع ہوئے ہیں جو ان کے تنقیدی شعور کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ ان میں "حیات جاوید" پر تبصرہ نے بڑی شہرت پائی جس کی وجہ سے اہل نظر کی نگاہیں آزاد کی طرف اٹھنے لگیں۔

آزاد کی وہ تحریریں جو "الندوہ" میں شایع ہوئی ہیں زیادہ گرانقدر ہیں، ان میں وہ مولانا شبلی سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ یہیں سے ان کی نثری تحریریں عالمانہ انداز اختیار کرنے لگتی ہیں۔ اس زمانے میں مولانا نے دوسرے چھوٹے چھوٹے رسائل بھی قلمبند کیے لیکن چونکہ وہ وقتی ضرورت سے لکھے گئے تھے اس لیے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

لیکن جب ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری ہوا اور اس میں مولانا کی زیادہ سے زیادہ تحریریں شایع ہونے لگیں تو نثر کی زبان اچانک تبدیل ہو کر "الہلالی" بن گئی۔ جس پر عربی فارسی کے اثرات نمایاں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود روکھی، پھیکی اور بوجھل نہیں تھی، بلکہ بڑی رواں، دواں، پروقار اور پرشکوہ تھی۔ مولانا کی خطابتی، ادّعاتی اور انانیتی طرزِ نگارش نے اس میں ایک خاص کیفیت اور تاثیر پیدا کر دی تھی، اس کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ مولانا قرآن کی آیتوں کو جگہ جگہ اپنی تحریروں میں استعمال کرنے لگے تھے تاکہ اپنی بات کو باوقار انداز سے سمجھا سکیں چنانچہ یہ بات "الہلال" کے سلسلہ میں عام طور سے کہی جاتی ہے کہ مولانا آزاد

نے پہلی بار قرآن کو روزمرّہ زندگی میں استعمال کرنے کا راستہ بتایا اور فیضیاب ہونے کے سلیقہ سے آگاہ کیا، الہلال، البلاغ اور الہلال دور ثانی کی زبان تقریباً ایک جیسی رہی۔ ان رسائل نے اگرچہ گہرے اثرات اپنے دور پر چھوڑے لیکن ان کی زبان قابلِ تقلید نہ بن سکی۔ یہ تو کچھ مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں کی کرامت تھی جو الہلالی اُردو استعمال کرنے پر قدرت رکھتے تھے اور مولانا آزاد کا فیض تھا کہ انھوں نے صحافت کی عام زبان کو، عالمانہ وقار اور ادبی شان عطا کی، بلاشبہ آج کہا جاسکتا ہے کہ الہلال (دورِ اوّل) کو بند ہوئے ستر سال ہورہے ہیں لیکن اُردو کو اس پایہ کا ہفتہ وار آج تک نصیب نہیں ہوا۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "مجھ کو تمام دنیا کی طرح معلوم ہے کہ صبر و تحمل اور ضبط و حزم بہرحال غیظ و غضب اور عجلت و بے صبری سے بہتر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تسامح و رواداری اور نرمی و لینت کی انسانی قلوب پر حکومت ہے اور سختی و خشونت انسان کی ملکوتی فضائل کی فہرست میں داخل نہیں۔ میں نے قرآن کریم میں پڑھا ہے کہ جب ایک داعی حریت اور مجاہد فی سبیل الحق کو خدا نے مصر کے شخصی فرمان رواں کے پاس بھیجا تھا تو کہا تھا کہ "وقولا له قولاً لینہ" میں دنیا کے اس سب سے بڑے شخص کی نسبت بھی سن چکا ہوں جس کو کہا گیا تھا کہ" فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ

وَلَوْكُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۱۲۴ "

"تذکرہ" مولانا آزاد کی پہلی مستقل کتاب ہے جو انھوں نے اگرچہ نہایت بے ترتیبی اور بے سکونی کی حالت میں لکھی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اسلاف کے حالات کو بہتر صورت میں اور اچھے مقصد کے لیے جمع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کی حیثیت یقیناً خود نوشت سوانح حیات کی نہیں ہوسکتی لیکن جدید تذکروں میں وہ ضرور شمار کی جاسکتی ہے جس کے پس پردہ خود مولانا کے افکار و خیالات جذبات و احساسات رغبت و نفرت اور ارباب صدق وصفا کے لیے احترام وعقیدت ہے۔ اس کا اسلوب کہیں کہیں خطیبانہ ہے اور پیرایہ بیان دل نشین لیکن عربیت اور فارسیت کی زیادتی نے کبھی کبھی اور کہیں کہیں اس کی دلکشی اور شیرینی مجروح کر دی ہے۔

الہلال کو مولانا آزاد نے دعوت کی حیثیت دی ہے یہ کتاب بھی مولانا کی اسی جذبہ دعوت کو تسکین پہنچاتی ہے اس کے ذریعہ انھوں نے علمار حق کے عظیم کردار، اعمال اور عزائم پیش کر کے ان کی راہ کو اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔

۱۹۱۲ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال جاری کیا تھا تو اس وقت انھوں نے محسوس کیا تھا کہ لوگ قرآن کو اس کی حقیقی شکل اور نوعیت میں جاننا چاہتے ہیں لیکن انھیں اس وقت کوئی تدبیر نظر

---

۱۲۴ "الہلال" ۸ر اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۲۷۵ (مساجد اسلامیہ اور خطبات سیاسیہ)

نہیں آئی تھی۔

پھر ۱۹۱۴ء ۱۹۱۵ء میں ان سے سوال کیا گیا تھا کہ "قرآن کی تعلیم کے لیے کیا کیا جائے"، تو وہ اس کا جواب نہیں دے سکے تھے لیکن اسی وقت سے اس سوال نے انھیں فکرمند کر دیا تھا۔ چنانچہ پہلی بار انھوں نے "البلاغ"، کے صفحات پر ترجمہ، تفسیر، مقدمہ تفسیر کا اعلان کیا مولانا آزاد کا خیال تھا کہ قرآن کی عام تعلیم کے لیے ترجمہ کافی ہوگا، مطالعہ کے لیے تفسیر ضرورت پوری کرے گی، اور اہل علم و نظر کے لیے مقدمہ مفید ہوگا۔

مگر بار بار نظربند کیے جانے اور خانہ تلاشی کے مرحلوں، ترجمان القرآن کے مسودوں کی ضبطی اور بربادی کی وجہ سے مولانا آزاد کو اگرچہ بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن قرآن فہمی کے لیے ترجمہ اور تفسیر کی جو خواہش تھی وہ کسی حالت میں کم نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس کی پہلی جلد ستمبر ۱۹۳۱ء میں وہ شائع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد دوسری جلد ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء کے آغاز میں منظر عام پر آئی۔ اس کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے:

جلد اوّل میں تفسیر سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقر تا سورہ الانعام
جلد دوم میں تفسیر الاعراف تا المومنون
تیسری جلد کا کام شروع ہوگیا تھا اور سورہ نور کی کتابت ہوگئی تھی پھر حالات نے ساتھ نہیں دیا اور یہ کام ادھورا ہی تھا کہ مولانا ۱۹۵۸ء میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کے بعد ساہتیہ اکادمی نے یہ طے کر کے کہ وہ مولانا کی تمام اہم تصانیف شایع کرے گی بڑی اہم ذمہ داری قبول کی۔

اس ذمہ داری کو پوری کرنے کے لیے ملک کے مایہ ناز محقق مالک رام صاحب کا تعاون حاصل کیا گیا ہے جنھوں نے دو جلدوں کے بجائے چار جلدوں میں ترجمان القرآن کو تقسیم کر کے شایع کر دیا ہے۔

مولانا آزاد کا یہ کام دوسرے علمی ادبی کاموں میں دینی خدمات کے لحاظ سے افضلیت رکھتا ہے اگرچہ حالات نے اس کام کو مکمل ہونے نہیں دیا لیکن بلاشبہ اس کی دینی، علمی اور ادبی حیثیت برابر رہے گی۔

اس میں مولانا آزاد نے بعض ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن سے عام مفسرین سرسری گزرے ہیں مولانا نے انھیں وضاحت سے دلائل کے ساتھ دلنشیں انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کے مطالعہ کی وسعت اور دقت نظر کا ثبوت ملتا ہے۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے چونکہ مولانا عربی فارسی میں بڑی اچھی صلاحیت کے مالک تھے اس لیے وہ اس کام سے نہایت خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں، انھوں نے ترجمہ کو محض لفظی ترجمہ رہنے نہیں دیا ہے اس میں وہ انداز اختیار کیا ہے کہ قاری کو مطالب تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے اسلوب عالمانہ، زبان شستہ اور عام فہم لیکن پروقار استعمال کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے تفسیر سورۂ فاتحہ" میں " سورت کی اہمیت اور خصوصیت" بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے اس لیے" فاتحۃ الکتاب" کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ جو بات زیادہ اہم ہوتی ہے قدرتی طور پر پہلی اور نمایاں جگہ پاتی ہے یہ

سورت قرآن کی تمام سورتوں میں خاص اہمیت رکھتی تھی
اس لیے قدرتی طور پر اس کی موزوں جگہ قرآن کے پہلے
صفحہ ہی میں قرار پائی"۔ [۱۲۵]

مجموعی حیثیت سے اردو میں قرآن کے دوسرے ترجموں میں "ترجمان القرآن" ان سے مختلف بھی ہے اور اہم بھی، مولانا سعید اکبر آبادی کا یہ کہنا بجا ہے :

"مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے چمن میں حسن انشا و بیان کے جو پھول کھلائے ہیں یوں تو سب ہی سدا بہار ہیں لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر "ترجمان القرآن" مولانا کی تمام علمی و ادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، قلم کی توانائی، اجتہاد فکر، وسعت نظر و مطالعہ اور جذبۂ تحقیق و تدقیق مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو اُن کی ہر علمی و ادبی تحریر میں نظر آتی ہیں لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں"۔ [۱۲۶]

مولانا ابوالکلام آزاد کو قدرت نے بہت سی دوسری خوبیوں کے ساتھ ایک خوبی یہ بھی عطا کی تھی کہ وہ خطابت کے فن سے اچھی طرح واقف تھے وہ جانتے تھے کہ کس موقع پر کن لوگوں میں کیا انداز تخاطب اختیار کیا جائے تاکہ

---

[۱۲۵] ترجمان القرآن جلد اول؛ ابوالکلام آزاد: ساہتیہ اکادمی ص ۳

[۱۲۶] ترجمان القرآن؛ سعید اکبر آبادی؛ آج کل دہلی ابوالکلام نمبر اگست ۱۹۵۸ء ص ۸۰

ان کی بات سامعین کے دلوں میں اترے اور ان کو متاثر کرے۔ اس کے تاریخی یا واقعاتی حوالے، منطقی دلائل، مواد کی ترتیب، خیالات کی تہذیب، اظہار خیال میں یقین و اعتماد کی فراوانی، بات کہنے کا سلیقہ، اِن ساری خصوصیات کی وجہ سے ان کی تقریروں اور خطبات نے بڑی انفرادیت حاصل کرلی تھی اور مقبولیت کا درجہ پا گئی تھی۔

عام طور سے مولانا آزاد کی زبان میں ایک خاص قسم کا وقار پایا جاتا تھا، گفتگو میں بھی وہ عالمانہ مزاج برقرار رکھتے تھے مگر جب تقریر کرتے یا خطبہ پڑھتے تو زبان کا جادو اور زیادہ جاگ جاتا۔ سامعین اُن کی سحر کاری سے مسحور و مبہوت ہو جاتے تھے، مولانا بات کہتے جاتے اور مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر، پڑے پردے اٹھاتے جاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا کہ معلومات کا دریا ہے جو بے تحاشا بہتا چلا جا رہا ہے لیکن ادبی وقار میں کمی پیدا نہیں ہوتی، حسب ضرورت آیات قرآنی سے بھی مدد لیتے تھے اور اشعار کے سہارے اپنی بات سمجھانے کی بھی کوشش کرتے تھے ملاحظہ کیجئے "توحید: اخوت اسلامی و عموم رشتہ دینی" پر روشنی ڈالتے ہوئے ۱۹۲۴ء میں اپنے خطبہ میں کہتے ہیں:

> "انسان کی یہ سب سے بڑی ضلالت اور خدا فراموشی تھی کہ اس نے رشتۂ خلقت کی وحدت کو بھلا کر زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں پر رشتے قائم کرلیے تھے خدا کی زمین کو جو محبت اور باہمی اتحاد کے لیے تھی قوموں کے باہمی اختلافات و نزاعات کا گھر بنا دیا تھا، لیکن اسلام دنیا میں پہلی آواز ہے جس نے انسان کی

بنائی ہوئی تفریقات پر نہیں بلکہ الٰہی تعبّد کی وحدت پر ایک عالمگیر اخوت واتحاد کی دعوت دی[127]

ان خطبات کی اہمیت آج اس لیے بھی ہے کہ ان کے مطالعہ سے مولانا آزاد کے مذہبی، سیاسی اور سماجی نظریات کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے بہت سے ایسے اہم واقعات سے آگاہی ہوتی ہے جن سے مولانا کی نظر اور نظریے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور نگاہوں میں ان کی قدر وقیمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

کسی ادیب، شاعر، فنکار، عالم، سیاستداں یا اپنے وقت کی اہم شخصیت کو سمجھنے اور اس کے حالات وکوائف اور زمانے سے آگاہ ہونے میں اس کے خطوط بڑی اہمیت رکھتے ہیں، لیکن ایسے خطوط جن کا لکھنے والا خط نگاری کے آرٹ سے واقف ہے انھیں دلچسپ بنا دیتا ہے اور ادب پارہ کا درجہ دلاتا ہے۔ یا اپنی علمی صلاحیت کا مرقع بنا دیتا ہے انکی اہمیت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

مولانا آزاد کے خطوط ایسے ہی بڑی اہمیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اب تک ان کے خطوط کے آٹھ مجموعے، مکاتیب ابوالکلام، کاروانِ خیال، نقش آزاد، مکاتیب ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، تبرکات آزاد، میرا عقیدہ "مولانا ابوالکلام آزاد کے نام خطوط وجوابات"، مختلف وقتوں میں منظرِ عام پر آچکے ہیں؛

اِن مجموعوں میں بہت سے خطوط عام طور سے اسی طرح کے ہیں،

---

[127] خطبات آزاد: مالک رام ص ۱۵

جیسے ہونے چاہئیں، یعنی مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے حالات جاننے یا کچھ بتانے یا دریافت کرنے کے لیے۔ جو خطوط عام حالات میں لکھے جاتے ہیں انھیں میں ان کا بھی شمار کیا جاتا ہے لیکن کچھ خطوط محض "استفسار" کے کے خانے میں آتے ہیں یعنی مذہبی مسائل، علمی مباحث، یا ادبی مشکلات کو سمجھنے یا سیاسی الجھنوں سے واقفیت کے لیے یا محض علمی عقائد سے آگاہی کے لیے یا مکتوب الیہ اور مولانا آزاد سے متعلق بعض شکوک کو رفع کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں جن کے جوابات انھیں کی روشنی میں مولانا نے دیے ہیں۔

"میرا عقیدہ"، "نقشِ آزاد"، "تبرکاتِ آزاد" اور دوسرے مجموعوں کے کچھ خطوط، اسی نوعیت کے ہیں۔ چونکہ ان خطوط میں سارا زور مکتوب نگار کی خلش کو دور کرنا ہوتا تھا اس لیے ان میں عام طور سے خط نگاری کی وہ خصوصیات نہیں پائی جاتی ہیں جو مولانا آزاد کا طرّۂ امتیاز ہیں۔

تیسرے قسم کے خطوط وہ ہیں جو مولانا نے یہ جان کر لکھے ہیں کہ یہ خطوط مکتوب الیہ تک یا تو نہیں پہنچ سکیں گے یا بہت تاخیر سے پہنچیں گے اس لیے ان خطوط کے جواب کی توقع نہ تھی جب بھی فرصت ملی مولانا بیٹھ گئے اور خط شروع ہوگیا۔ پھر تو مولانا مکتوب الیہ کے تصور میں اپنی دنیا میں کھوگئے اور اس طرح یہ خطوط درازسے درازتر ہوتے گئے۔ یہ سارے خطوط بھرپور ادبی شان لیے ہوئے ہیں اور فکر انگیز ہیں۔

اِن میں کبھی وہ انشائیہ نگار بن جاتے ہیں، کبھی کہانی کار، کبھی مورخ، کبھی فلسفی، کبھی محقق، کبھی ناقد، کبھی موسیقی نواز، کبھی انسانیت

کے علمبردار اور کبھی محض ایک خط نگار یہ سارے خطوط غبار خاطر میں جمع ہیں اور اردو ادب میں اہم اضافہ ہیں، ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے، تاریخ کے اوراق سامنے آجاتے ہیں :

" یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے مگر قلعہ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا تو قصد بھی کیا تھا، مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی، یہ شہر بھی ہندوستان کے ان خاص مقامات میں سے ہے، جن کے ناموں کے ساتھ، صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہوگئیں ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں آباد تھا پندرھویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑگئی تو ملک احمد نظام الملک بھیری نے علم استقلال بلند کیا اور بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جنیر کی جگہ اسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دارالحکومت یہی مقام بن گیا۔" ۱۲۸

" چڑیا چڑے کی کہانی " بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :

" موتی کے گھونسلے سے ایک بچے کی آواز عرصہ سے آرہی تھی۔ جب وہ دانوں پر چونچ مارتی، تو ایک دو دانوں سے زیادہ نہ لیتی اور فوراً گھونسلے کا رخ کرتی وہاں اس کے

---

۱۲۸ غبار خاطر مرتبہ مالک رام ساہتیہ اکادمی دلی ۱۹۷۱ء ص ۲۵

پہنچتے ہی بچّے کا شور شروع ہو جاتا۔ ایک دو سکنڈ بعد پھر آتی اور دانہ لے کر اڑ جاتی۔ ایک مرتبہ میں نے گنا تو ایک منٹ کے اندر سات مرتبہ آئی گئی" ۱۲۹

ایک خط میں "انسان" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہاں اس کے چاروں طرف پستیاں ہی پستیاں ہیں جو اسے انسانیت کی بلندی سے پھر حیوانیت کی پستیوں کی طرف لے جانا چاہتی ہیں، حالانکہ وہ اوپر کی طرف اڑنا چاہتا ہے وہ عناصر کے درجہ سے بلند ہو کر نباتاتی زندگی کے درجہ میں آیا نباتات سے بلند تر ہو کر حیوانی زندگی کے درجہ میں پہنچا پھر حیوانی مرتبہ سے اڑ کر انسانیت کی شاخ بلند پر اپنا آشیانہ بنایا اب وہ اس بلندی سے پھر نیچے کی طرف نہیں دیکھ سکتا اگرچہ حیوانیت کی پستی اسے برابر نیچے ہی کی طرف کھینچتی رہتی ہے وہ فضا کی لا انتہا بلندیوں کی طرف آنکھ اٹھاتا ہے" ۱۳۰

یہ اقتباسات غبار خاطر کے خطوط کی قدر و قیمت اور مزاج کو سمجھنے میں کسی قدر معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے زیادہ اقتباسات نہیں پیش کیے گئے ہیں۔

اِن کے علاوہ مولانا آزاد کی کتب اور رسائل کی ایک لمبی فہرست ہے

---

۱۲۹ غبار خاطر مرتبہ مالک رام ساہتیہ اکادمی دلی ۱۹۷۱ء ص ۲۲۹

۱۳۰ " " " " " ص ۱۱۵

جو رسائل کی صورت میں یا مضامین کے مجموعہ کی شکل میں ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد شایع ہوتے رہے ہیں جن کی اہمیت اور قدر و قیمت مسلّم ہے ان کے مطالعہ سے آزاد شناسی میں یا ان کے زمانے سے آشنائی میں آسانی ہوتی ہے۔ گو مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا بڑا حصہ سیاست کی نذر ہوا پھر بھی ان کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، سماجی تحریریں انھیں صفِ اوّل کے مصنفین میں جگہ دلانے کے لیے بہت کافی ہیں ــ مولانا ایک عالم دین، دانشور، ادیب، صاحب طرز انشاپرداز کی حیثیت سے نہایت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اور حقائق سامنے آتے جائیں گے ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا اور وہ عظیم سے عظیم تر ہوتے جائیں گے۔

کتابیات

۱ ترجمان القرآن (جلد اوّل) از ابوالکلام آزاد ساہتیہ اکادمی نئی دلّی تیسری بار ۱۹۸۰ء

۲ تذکرہ (مرتبہ مالک رام) از ابوالکلام آزاد ساہتیہ اکادمی نئی دلّی دوسری بار ۱۹۸۱ء

۳ خطبات آزاد (مرتبہ مالک رام) از ابوالکلام آزاد ساہتیہ اکادمی نئی دلّی پہلی بار ۱۹۷۴ء

۴ غبار خاطر (مرتبہ مالک رام) از ابوالکلام آزاد ساہتیہ اکادمی نئی دلّی پہلی بار ۱۹۶۷ء

۵ مکاتیب ابوالکلام از ابوالکلام آزاد ادبستان لاہور بار اوّل

۶ نقش آزاد (مرتبہ غلام رسول مہر) از ابوالکلام آزاد کتاب منزل لاہور ۱۹۵۸ء

۷ تبرکات آزاد (مرتبہ غلام رسول مہر) از ابوالکلام آزاد ادبی دنیا اردو بازار دہلی بار اوّل ستمبر ۱۹۶۴ء

۸ کاروان خیال از امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مالک اخبار مدینہ بجنور پہلی بار ۱۹۴۶ء
وصدر یار جنگ

۹ مکاتیب ابوالکلام آزاد از ابوالکلام آزاد اردو اکیڈمی سندھ پہلی بار فروری ۱۹۶۸ء
(مرتبہ ابوسلمان شاہجہاںپوری)

۱۰ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی از ابوالکلام آزاد حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی بار اوّل اپریل ۱۹۵۸ء
(بہ روایت ملیح آبادی)

۱۱ انڈیا ونس فریڈم مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹ لونگ مین بار اوّل جنوری ۱۹۵۹ء

۱۲ ہماری آزادی (مرتبہ محمد مجیب) از ابوالکلام آزاد اورینٹ لونگ مین تیسری بار ۱۹۷۶ء

قول فیصل ابوالکلام آزاد چمن بک ڈپو دہلی

۱۴ تحریک نظم جماعت مولانا ابوالکلام آزاد نذیر سنز پبلشرز دہلی اشاعت اول ۲۲ فروری ۱۹۷۸ء
(مولفہ ابوسلمان شاہجہانپوری)

۱۵ ابوالکلام مرتبہ علی جواد زیدی ثقافتی سب کمیٹی سری نگر کشمیر پہلی بار ۱۹۵۹ء

۱۶ آئینہ ابوالکلام آزاد مرتبہ عتیق صدیقی انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دہلی پہلی بار نومبر ۱۹۷۶ء

۱۷ امام الہند (تعمیر افکار) از ابوسلمان شاہجہانپوری مکتبہ اسلوب کراچی اشاعت اول اگست ۱۹۶۲ء

۱۸ آثار ابوالکلام آزاد (نفسیاتی مطالعہ) از قاضی محمد عبدالغفار آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۶۳ء

۱۹ ارمغان آزاد (جلد اوّل) مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری آزاد اکیڈمی کراچی اشاعت ثانی ۲۲ فروری ۱۹۷۸ء

۲۰ مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری مرتب اثر بن یحییٰ انصاری عالیہ پبلیکیشنز دھولیہ یکم دسمبر ۱۹۸۲ء

۲۱ مولانا آزاد اور ان کے ناقد مرتبہ ایم۔ اے شاہد موڈرن پبلشرز، صدر کراچی ۲۲ فروری ۱۹۸۱ء

۲۲ ابوالکلام آزاد عرش ملسیانی پبلیکیشنز ڈویژن دہلی اگست ۱۹۷۴ء

۲۳ حیات شبلی سید سلیمان ندوی دارالمصنفین، اعظم گڑھ طبع ثانی ۱۹۷۱ء

۲۴ سید عطاء اللہ شاہ بخاری شورش کاشمیری چٹان لاہور اشاعت جدید نومبر ۱۹۷۳ء

۲۵ نمود ہستی سید محمد حسنین دائرہ اردو گیا بار اوّل ۱۹۸۰ء

۲۶ دی ہسٹری آف دی کانگریس بی پٹابھی سیتارمیا ایس چاند اینڈ کمپنی بار دوم ۱۹۶۹ء

۲۷ تاریخ جمعیۃ علماء ہند مرتبہ ادیسر اوروی الجمعیۃ بک ڈپو دہلی ۶ ربیع الاوّل ۱۴۰۲ھ

۲۸ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر (صبح) عبداللطیف اعظمی (مدیر) انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دہلی پہلا شمارہ ۱۹۷۰ء

۲۹ ابوالکلام نمبر (آج کل اردو) بالمکند عرش (مدیر) پبلیکیشنز ڈویژن دہلی اگست ۱۹۵۸ء

۳۰ آزاد نمبر (اردو ادب) آل احمد سرور (مدیر) انجمن ترقی اردو (ہند) (علی گڑھ) ۱۹۵۹ء

۳۱ مولانا ابوالکلام آزاد (مضمون) مالک رام سہ ماہی تحریر دہلی جلد ۲ نمبر ۸ ۱۹۶۸ء

۳۲ مولانا ابوالکلام اور خدنگ نظر (مضمون) عبدالقوی دسنوی ہفتہ وار ہماری زبان علی گڑھ یکم نومبر ۱۹۶۹ء

۳۳ اعلان الحق از ابوالکلام آزاد سہ ماہی تحریر دہلی جلد ۲ نمبر ا ۱۹۶۸ء

۳۴ ماہنامہ لسان الصدق ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء تا جولائی ۱۹۰۴ء

۳۵ الہلال ہفتہ وار کلکتہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء سے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء

۳۶ الہلال ہفتہ وار کلکتہ دور ثانی ۱۰ جون ۱۹۲۷ء سے ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء

۳۷ البلاغ ہفتہ وار کلکتہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء

۳۸ پیغام ہفتہ وار کلکتہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء سے ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء